پس چہ باید کرد مع مسافر

(ایک جائزہ)

سہیل عمر

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور

پس چہ باید کرد مع مُسافر

(ایک جائزہ)

رفیق خاور

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق اقبال اکادمی محفوظ ہیں

۱۰۵۲۳

ناشر : ڈاکٹر محمد معز الدین
ڈائرکٹر اقبال اکادمی پاکستان
۱۱۶- میکلوڈ روڈ لاہور

طابع : سید ظفرالحسن رضوی

مطبع : ظفر سنز پرنٹرز کوپر روڈ لاہور

تعداد : ۵۰۰

طبع اول : ۱۹۸۱ء

قیمت : ۱۲-۰۰ روپے

پیش لفظ

اقبال کی تصانیف میں ایک ہی احساس یکساں طور پر کارفرما ہے - لیکن جیسے جیسے نفسِ موضوع میں تبدیلی پیدا ہوتی رہی اس کی نوعیت بھی بدلتی گئی - ''اسرار و رموز'' میں خودی و بے خودی پر مدلل بحث کے لیے مسلسل پیرایہ ہی موزوں تھا جس کے لیے مثنوی کی صنف اختیار کی گئی - لہذا اس کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے کتنے ہی جدا کیوں نہ ہوں، وہ باہمدگر مربوط ہیں - ''پیام مشرق''، ''زبورِ عجم''، ''ضربِ کلیم'' اور ''بالِ جبریل'' میں غنائیہ عنصر نمایاں ہے - اس لیے ان کی ہیئت زیادہ تر غزلیہ ہے اور ان میں افکار و خیالات کو جستہ جستہ فن پاروں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے - ''جاوید نامہ'' کی وضع ان سب سے مختلف ہے جس میں گوناگوں افراد، کوائف و مناظر اور حالات و واقعات کی وجہ سے ڈرامائی عنصر غالب ہے اور پیرایہ بھی مرکب ہے -

''ارمغانِ حجاز'' سے قطع نظر جو متفرق قطعات اور مباحث پر مشتمل ہے، ''پس چہ باید کرد'' ہیئت کے اعتبار سے ''اسرار و رموز'' ہی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے اور اس کے پسِ پردہ وہی ذہن اور افکار و خیالات بہ اندازِ دگر کارفرما ہیں - لیکن چونکہ مطمح نظر فلسفۂ حیات کے رموز و نکات نہیں بلکہ وہ حکمتِ عملی

اور تدابیر و مصالح ہیں جو نئے پیدا شدہ حالات میں درکار ہیں تا کہ مشرق کی دیرینہ روحانیت مغرب کی مادی تہذیب و تمدن کا مقابلہ کر سکے اور عالمی حالات کو صحت مندانہ نہج عطا کرنے میں کوشاں ہو ۔ اقبال کے نزدیک تہذیبِ مغرب کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں دین و سیاست کو ایک دوسرے سے جدا کر کے الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں نظامِ عالم دگرگوں ہوکر رہ گیا ہے اور مشرق ہو یا مغرب یکساں طور پر افراتفری کا شکار ہیں ۔

من درون شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

لہٰذا شاعر اُن متضاد عناصر کی نشان دہی کرتا ہے جو حکمت و سیاست کی دنیا میں دست و گریباد ہیں ۔ یعنی حکمت فرعونی اور حکمتِ کلیمی ، سیاسیات حاضرہ اور شریعت ۔ مدعا آخر کار تخریب سے تعمیر کی طرف اقدام ہے جسے اقبال مذہب کی اصطلاح میں لا اور الا سے تعبیر کرتے ہیں ۔

کہا جاتا ہے کہ اقبال کا سارا کلام بمنزلۂ جسم اور ''پس چہ باید کرد'' اس کا دل ہے ۔ جب علامہ کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے تبسم زیر لب سے اس کی تائید کی ۔ اگر یہ درست ہے تو پھر اور بھی ضروری ہے کہ اس کا نظر غائر سے مطالعہ کیا جائے اور اُن امور کی وضاحت کی جائے جو اس تصنیف کو اقبال کی

دیگر تصنیفات سے ممیز کرتے ہیں خواہ وہ ''اسرار و رموز'' ہی کی حالات حاضرہ کی روشنی میں مزید توضیح ہوں ۔ظاہر ہے کہ اقبال کا دور ایک شدید آشوب و ہیجان کا دور تھا ، اور اس سے اضطراب آفریں واقعہ مغرب کا ہمہ گیر غلبہ و اقتدار اور دنیائے مشرق ، بالخصوص عالم اسلام کی شکست و ریخت تھا ، اس لیے دیگر ہم عصر دانشوروں کی طرح اقبال کے دل و دماغ پر بھی حالات کی پُرآشوب نوعیت حاوی تھی اور وہ اس نظم میں اپنے کرب و اضطراب کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے ۔ خصوصاً اس لیے کہ اقوام مغرب کے استیلا اور استعمار کی زد زیادہ تر دنیائے اسلام بلکہ خود اسلام پر تھی جو صالح ترین ، ارفع و اعلیٰ اقدار کا آئینہ دار تھا ۔ چنانچہ اس کی وضاحت ابتدا ہی میں کر دی گئی ہے :

ع کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

لہذا ''ضرب کلیم'' کی طرح ''پس چہ باید کرد'' بھی عہد حاضر کے خلاف اعلانِ جہاد ہوتے ہوئے اس کے طور و طریق اور حکمت عملی کی نشان دہی ہے ۔ اکبر الہ آبادی کی طرح ان کے نزدیک بھی ترقی مستقل وہ ہے جو روحانی ہو ۔ اس لیے اقبال کو مجبوراً مشرق کو مغرب کی لادینی کے خلاف ابھارنا پڑا ۔

اگرچہ ''پس چہ باید کرد'' ہیئت کے اعتبار سے ''اسرار و رموز'' کی بازیافت ہے تو ''مسافر'' ''جاوید نامہ'' کی پیش قدمی یا نقشِ اولیٰ ہے کیونکہ اس میں مثنوی اور غنائیہ دونوں کی آمیزش ہے اور

کہیں کہیں خفیف طور پر ڈرامائی پیرایہ بھی جھلکتا ہے ۔ چونکہ بنیاد عینی مشاہدہ ہے اس لیے ہم شاعر کے ہمراہ زمینی سفر کے ساتھ ساتھ ذہنی سفر کے مراحل بھی طے کرتے ہیں اور بالآخر اسی مقام پر پہنچ جاتے ہیں جو اقبال کی فکر و نظر کا منتہا ہے ۔

اقبال نے افغانستان کو ایشیا کا دل قرار دیا ہے ۔ خبر نہیں آج وہ زندہ ہوتے اور اس دل پر روس کا جارحانہ اقدام دیکھتے تو ان کے احساسات کیا ہوتے ۔ اور افغانستان ہی کیا دنیائے اسلام کی موجودہ حالت ، خصوصاً ایران و عراق کے تصادم کو دیکھ کر ان پر کیا گزرتی جب کہ یہ آشوب اس سے کہیں زیادہ سنگین اور روح فرسا ہے جو ان کی نگاہوں نے اپنے زمانے میں دیکھا تھا ۔ اب حرم کو اسرائیل اور دیگر بد اندیشوں سے کہیں زیادہ خطرہ ہے جو بظاہر صلیبی جنگوں سے کہیں زیادہ سنگین ہے ۔ شاید عالم اسلام کے بارے میں ان کی زبان پر بار بار یہی شعر آتا کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یہ کتاب وہ مقدمہ ہے جو علامہ کے جشن صد سالہ کی تقریبات منعقدہ ۱۹۷۷ء کے سلسلے میں ''پس چہ باید کرد'' اور ''مسافر'' کے منظوم تراجم کے لیے تحریر کیا گیا ۔ ارادہ تھا کہ اسے انہی تراجم کے ساتھ شائع کیا جائے لیکن یہ مقدمہ طویل ہونے کے سبب بطور تبصرہ علیحدہ ایک کتابچے کی شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش ہے ۔

آخری صفحات میں ترجمہ کے متعلق اشارات منظوم تراجم ہی کی بنیاد پر کئے گئے تھے - اور انہیں اسی سلسلہ کی کڑی سمجھنا چاہیے -

رفیق خاور

۳۲ سی/۲
پی ای سی ایچ ایس
کراچی - ۲۹
۲ اگست ۱۹۸۱ء

پس چہ باید کرد و مسافر —— ایک جائزہ

''اسرار و رموز'' کے ساتھ جس آہنگ کا آغاز ہوا ، تھا ''مسافر'' اور ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' اس کے دو مختصر مگر اہم مظہر ہیں ۔ یہ دونوں اقبال کی فارسی میں آخری مثنویاں ہیں جو ان کے ''شاہکار'' ''جاوید نامہ'' کے بعد تصنیف ہوئیں ۔ ''مسافر'' پہلی بار ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی اور پھر دونوں مثنویاں ۱۹۳۶ء میں یکجا شائع ہوئیں ۔ غالباً اس لیے کہ یہ ایک ہی دور کی پیداوار ہیں ۔ اور موضوع میں یکسانیت کے علاوہ دیگر عناصر ، خصوصاً اقبال کی مرغوب مثنوی معنوی کی بحر (رمل مسدس مقصور) اور لب و لہجہ بھی مشترک ہیں جن کے سبب ایک میں دوسری کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان کے یکجا شائع ہونے میں ان کی مختصر نوعیت کو بھی دخل ہے ۔

''پس چہ باید'' میں اقوام شرق بالخصوص مسلم اقوام سے خطاب ہے جو اقبال کی دلچسپیوں اور فکر و فن کا محور ہیں ۔ افغانستان بھی انھی میں شامل ہے ۔ اس لیے اقبال کے دورۂ افغانستان کی روئداد درحقیقت ''پس چہ باید'' ہی کا حصہ ہے اور پھر جس طرح افغانستان کا ذکر کرتے ہوئے اسے ''ایشیا کا دل'' کہا گیا ہے ، اسی طرح ''پس چہ باید'' میں ایشیا کو جو دین و ہنر کا سرچشمہ ہے ، تمام تر سوز و ساز و درد و داغ قرار دیا گیا ہے ۔ حسب معمول رومی کی روح دونوں پر چھائی ہوئی ہے ۔ خود اقبال کا لب و لہجہ اور انداز بھی یکساں

کیفیت پیدا کرتا ہے ۔ جلال و جمال اور قاہری و دلبری کا امتزاج جس میں سادگی اور پُرکاری ایک دوسرے سے ہمکنار ہیں ، دونوں کے ہم وضع ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے ۔ چونکہ ان کا مقصد زیادہ تر مشرق کی صورت حال کی توضیح اور حل مشکلات کے لیے تدابیر پیش کرنا ہے ، اس لیے ان میں اسرار و رموز کی طرح حکیمانہ افکار پر زور نہیں ۔

اپنی وسیع و ہمہ گیر دلچسپیوں کے باوجود جو اقبال کو ''دنیا کا شہری'' بناتی ہیں ، ان کی وابستگیاں دنیائے مشرق ہی کے ساتھ ہیں جن کی بنا پر انہیں عموماً شاعر مشرق کہا جاتا ہے ۔ اگرچہ ایسے وسیع المشرب شخص کو جس کے دل میں جز ہمدردیٔ انسان کوئی سودا نہ ہو اور جو کسی اعتبار سے بستۂ رنگ خصوصیت ہونے کا خواہاں نہیں ، کسی خاص مقام سے وابستہ کرنا بجا نہیں ، خصوصاً جب انہوں نے ''پیام مشرق'' کے دیباچہ کے آخر میں صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ :

> '' اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک شرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالا تر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہونا قابل احترام ہے ''۔

لیکن ان کا مغرب کے خلاف مشرق سے لگاؤ ، خواہ اس کے وجوہ کچھ ہوں ، پوشیدہ نہیں ۔ یہ مے ان کے کلام سے رہ رہ کر چھلکی پڑتی ہے :

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست
ہم شـــراب و ہم ایـــاغ از آسیاست
عشق را مـــا دلـــبری آمـــوختیم
شـــیـــوۂ آدم گـــری آمـــوختیم
ہم ہنر ہم دیں ز خاک خاور است
رشکِ گردوں خاکِ پاکِ خاور است
وانمـــودیم آنچہ بود انـــدر حجاب
آفـــتاب از مـــا و مـــا از آفـــتاب[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ ابتدا میں ''خطاب بہ مہر عالمتاب'' کی حیثیت بھی علاماتی ہے ۔

سوال اٹھتا ہے کہ اگر مشرق ہی سے سروکار ہے تو اس کی تخصیص کیوں ؟ دنیائے مشرق میں افریقہ بھی تو شامل ہے ۔ اور خود ایشیا میں روس کا معتدبہ حصہ بھی واقع ہے ۔ یہاں تک کہ جاپان کو بھی سمندر پار مغرب ہی تصور کیا جاتا ہے ۔ وادیٔ نیل قدیم الایام سے مذہب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہی ہے ۔ جہاں سے تمدنی اثرات عرصۂ دراز تک دور دور پھیلتے رہے ہیں ۔ بعد کی تمام تہذیبیں اس سے اثر پذیر ہوتی رہی ہیں ۔ قدیم مصر کے تصورات نے ایشیائی مذاہب میں بھی نفوذ کیا ہے ۔ اور یہ تو حقیقت ہے کہ یونان اور یورپی ممالک پر نصرانیت کی راہ سے اس کا اثر آج تک طاری و ساری ہے ۔ نصرانی تثلیث کا ماخذ مصری تثلیث تھی ۔ تو پھر مذہب اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مصر کا استثنا کیوں ؟

---

۱ ۔ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ص ۶۰ ۔

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ مصر کو بھی ایشیا ہی کا حصہ سمجھنا چاہیے ، دونوں جغرافی اعتبار سے ایک ہی مضمون ہیں ۔ ان میں فقط بحر احمر ہی تو حائل ہے ۔ اور غربی ایشیا اور مصر میں برابر رابطہ قائم رہا ہے ۔ دوسرے ، ایشیا نہ سہی ، مصر کا دامن مشرق سے تو وابستہ ہے ، لہذا اقبال نے ایشیا کے گہوارۂ دین و ہنر ہونے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے ، اس کا اطلاق مصر پر بھی ہے ۔ ایشیا کے ساتھ ''خاک پاک خاور'' کی وضاحت اس کی موید ہے ۔

اس شعر میں ''سوز و ساز و درد و داغ'' اور ''ہم ہنر ، ہم دین ز خاک خاور است'' بھی غور طلب ہیں ۔ اقبال نے دیگر مقامات پر بھی بار بار مشرق کے روحانیت کا سرچشمہ ہونے پر زور دیا ہے ۔ تاریخی اعتبار سے بلا شبہ اکثر مذاہب ۔ ہندو مت ، جین مت ، بدھ مت ، مانویت ، مجوسیت ، کنفوشیت ، شنٹوازم ، موسویت ، نصرانیت اور اسلام ۔ مشرق ہی سے ظہور پذیر ہوئے ہیں اور یورپ میں آج تک نصرانیت ہی کا دور دورہ ہے ۔ لیکن سوال مذاہب کا نہیں بلکہ نقشِ مذہب کا ہے ۔ یعنی کیا کوئی ایسی سرزمین ہے جس کے باشندے مذہبی احساس سے بیگانہ رہے ہوں خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو ؟ قدیم سے قدیم وحشی انسانوں سے لے کر جدید سے جدید مہذب انسانوں تک مذہب کی روح کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود رہی ہے یعنی انفس و آفاق کے باہمی ربط کا وجدان ، عظیم کائناتی قوتوں کے ساتھ رابطہ ، افراد بشر کا فوقانی قوتوں پر مطلق انحصار ، قدرت کے پُر اسرار عوامل کے سامنے اطاعت و تسلیم ،

غیب ، مافوق التصور ، مافوق الفطرت پر اعتقاد ، خوف ، درماندگی اور بیچارگی کا احساس ۔ مظنونات اور ترددات جو قوائے انسانی کے آزادانہ عمل میں سدراہ ہوں وغیرہ وغیرہ ۔ مذہب کے وسیع ترین مفہوم کے مطابق ممکن نہیں کوئی انسان بھی مذہب سے بیگانہ ہو ۔ وہ بربہا یعنی منسار شکتی جو ہندو دھرم کی نیو ہے ، بعینہٖ کتنی ہی قدیم اقوام مثلاً جزائر میلان کے باشندوں اور سرخ ہندیوں میں بھی پایا جاتا ہے ۔ تمام اشیائے فطرت کے ذی روح ہونے کا تصور ابتدا ہی میں پیدا ہوگیا تھا ۔ قدیم جرمن اور اسکینڈے نیویا کے لوگ جنگلات کو ہر طرح کی غیبی مخلوقات سے پُر خیال کرتے تھے ۔ فرانس میں جنگلات کو مقدس سمجھتے ہوئے درختوں کی پوجا کی جاتی تھی ۔ اس عام احساس میں انگلستان کے ڈروئڈ بھی ان کے شریک تھے ۔ ان کی قربان گاہیں آج بھی دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھانے کی داستان سناتی ہیں اور یونان تو برابر مذہب کا گہوارہ رہا ہے ۔ بعد میں روما بھی اپنے طور پر مذہبی شعور کا حامل رہا ۔ کرافٹ اے بنگ اور ہیولاک ایلس کی رائے میں بڑی بڑی بزرگ خواتین کے رویا درحقیقت جنسی احساسات ہی کے مظہر تھے ۔ ہوبہو میرا بائی کی طرح کے ہری کی مہما میں بھجن دھرتی ہی کی پریت پکار تھے ۔ نصرانیت نے یورپ میں اس وقت قدم رکھا جب یونان اپنی توانائی سے بھرپور دیومالائی (آتمائی) دور ختم کر چکا تھا اور اسے حالات پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا ۔

در شکست خویشتن بے اختیار افتادہ ام !

اس تیزی سے پیدا ہوتے ہوئے خلا کو نصرانیت نے پورا کیا جو ایک شکست خوردہ قوم کے عوام کے لیے مطلوبہ تسکین و تشفی کا باعث

ہوئے ۔

اس سلسلے میں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تابو ، ٹوٹم اور رجال پرستی جو مذہب ہی کے نمایاں لوازمات ہیں ، یورپ کے ہر حصے میں برابر کارفرما رہے ہیں ۔ اور تحقیق سے اس کے جملہ آثار دستیاب ہوتے ہیں ۔ لہذا مشرق و مغرب میں صرف اتنا فرق نظر آتا ہے کہ ایک میں شاید وسیع و عریض ہونے کے باعث بڑے بڑے مذہب رونما ہوتے رہے اور دوسرے میں جامع مظاہر وجود میں نہ آ سکے ۔

دین کے ساتھ یونان ، روما اور دیگر مقامات نے اپنے اپنے طور پر ہنر کا مظاہرہ بھی کیا ہے ۔ مجسمہ سازی ، فنِ تعمیر ، شعر و ادب اور فلسفہ و حکمت میں یونان و روما کے تہذیبی مظاہر آج بھی یادگار ہیں ۔ مجسمہ سازی کی حد تک ان کا دور اس گندھارا آرٹ میں دکھائی دیتا ہے جن کا موضوع مقامی لیکن فن یونا رومی ہے ۔

اس سے قطع نظر اگر روحانیت کے رخ سے بھی پردہ اٹھایا جائے تو عجب نہیں کارل مارکس اور اس کے ہم خیالوں کے مطابق ''باراں دیگرے را می پرستند'' کی کیفیت پیدا ہو ۔ یعنی روحانیت کے پردے میں مادیت کارفرما ہو ۔ اس کے برعکس ایسی تہذیب بھی جو بظاہر خالصتاً مادی ہو درحقیقت روحانی ہو سکتی ہے ۔ ایسا کوئی قطعی معیار نہیں جس سے مادیت و روحانیت کے ڈانڈے پوری طرح الگ کیے جا سکیں ۔ مذہب اور تقدس کے پردے میں استحصال اور استعمار کوئی نئی بات نہیں ۔

مذکورہ بالا امور کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے ۔ لیکن مشرق میں جس کثرت سے مذاہب رونما ہوئے ہیں اور اب بھی مذہبی استیلا کی عمومیت کے پیشِ نظر مشرق کی مذہب و روحانیت سے وابستگی ظاہری اعتبار سے قابلِ فہم ہے ۔ اقبال نے بھی اسی کو اپنے تصورات کی بنیاد ٹھہرایا ہے ۔ ان کی زادبوم مشرق کی سرزمین تھی ۔ جب سے انھوں نے آنکھ کھولی ان کے گرد و پیش مشرق ہی کی فضا تھی ۔ ماحول نے ان کے دل و دماغ کو جس سانچے میں ڈھالا وہ ڈھلتے گیے ۔ اسلامی نکتۂ نظر کے مطابق ہر فرد فطرتاً بے رنگ ہوتا ہے ۔ اس کی اصلی فطرت ایک صاف لوح کی طرح ہوتی ہے جس پر حالات و واقعات اپنے نقوش مرتسم کرتے رہتے ہیں ۔ اس لیے اس کی شخصیت ماحول ہی کا عکس ہوتی ہے ۔ حالات و ظروف اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتے ہیں اور وہ انھی کے ضمن میں سوچتا اور عمل کرتا ہے ۔ علم النفس کا کرداری (Behaviourist) دبستان بھی جبلی و موروثی خصوصیتوں کے برعکس کسب خارجی کا قائل ہے ، اور اس کے تجربات سے ذہن و شخص کی حیرت انگیز مثالیں سامنے آئی ہیں ۔ اس حد تک عام مشاہدہ سے کم از کم اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ انسان پر ابتدا ہی سے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ، اس کی فطرت کو ایک مخصوص وضع عطا کر دیتے ہیں ۔ خاندان انسان کی اولیں درسگاہ ہے ، اور اس کے اثرات رگ و پے میں کچھ اس طرح سرایت کر جاتے ہیں کہ خیالات و معتقدات اکثر و بیشتر خاندانی اثرات ہی کی پیداوار بن جاتے ہیں ۔ اسلامی ، نصرانی یا ہندو گھرانے انہی ہی چھاپ یا شبیہہ پیدا کرتے ہیں جو شاذ و نادر تبدیل

ہوتی ہے ۔

اقبال کی پیدائش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جسے مذہب اور تصوف کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا ۔ انھوں نے خود ہی اس کی وضاحت کر دی ہے :

گر نیابی صحبتِ مرد خبیر ازاب وجد آنچہ من دارم بگیر[1]

اس زمانے میں دین و ایمان کا گھر گھر چرچا تھا اور شاعرِ مشرق کے گھرانے میں ان کا اثر کچھ زیادہ ہی رچا بسا ہوا تھا ۔ وہ ایسی فضا میں پروان چڑھے جس میں ذہن پوری طرح جذب و شوق میں ڈوب جاتا ہے ۔ قرآن ، حدیث ، شریعت ، طریقت ، اسلام اور اس کی قدریں ، اس کی روایت اور اس کا تمام خارجی و باطنی ورثہ یہ سب ایک حساس طبیعت میں پوری شدت سے سما گئے ۔ اسلام ، خصوصاً قرآن اور عربی میں تعلیم کا آغاز بچپن ہی میں ہو گیا تھا ۔ اس سلسلے میں اقبال کے مولد سیالکوٹ ہی کے ایک قدیم خاندان کے فرد ونگ کمانڈر (ریٹائرڈ) سید انور جعفری کا یہ بیان بروایت میر ایچ شوکت کاظمی دلچسپی سے خالی نہیں :

''اقبال کی زندگی کا پہلا اہم واقعہ جس نے شروع ہی سے ان کے ذہن و شخص پر اسلام کا گہرا نقش ثبت کر دیا ، یہ تھا : اقبال بچپن میں محلے کے کھلنڈرے بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے رہتے تھے ۔ ان کے والد جو اپنے گھر پر ہی ٹوپیوں کا کاروبار کرتے تھے انہیں حکیم حسام الدین کی مسجد میں لے گئے جہاں

---

۱ ۔ جاوید نامہ ص ۲۴۴ ۔

احمد شاہ[1] عربی اور قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے - آپ نے شاہ صاحب سے التماس کی : شاہ صاحب ! اس بچے کو اپنا ہی بچہ خیال کریں اور اس کی تعلیم پر توجہ فرمائیں ، شاہ صاحب نے بخوشی یہ ذمہ داری قبول کر لی اور بچے کو عربی اور قرآن مجید میں درس دینا شروع کیا - چونکہ اقبال بے حد ذہین تھے اس لیے انھوں نے جلد ہی دونوں میں عبور حاصل کر لیا اور مقامی اسکول میں داخل ہوگئے -"

اور بھی جن جن بزرگوں سے ملاقات ہوئی وہ درویش سیرت ، صوفی مشرب اور دین و مذہب کے پرستار تھے - ظاہر ہے کہ اقبال کی ابتدائی تربیت میں فرائض و سنن کی پابندی کے علاوہ جو اسلامی گھروں میں عام ہے - قرآن ، حدیث ، تفسیر اور فقہ وغیرہ کو خاص دخل ہوگا جس نے ان کے علم و فضل اور ذہن و شخص کی اساس قائم کر دی - رفتہ رفتہ بوقلموں عناصر نے ایک مخصوص مجموعۂ فکر و نظر کی شکل اختیار کر لی - ان میں اس فیضِ صحبت کو بھی نمایاں دخل ہوگا جس پر اقبال نے بار بار زور دیا ہے - اس طرح ایک واضح پیکر ابھرا جس سے گرد و پیش کی طرف ایک خاص رجحان رونما ہوتا ہے -

بیرونی فضا بھی گھر ہی کی فضا کا نمونہ تھی جس میں معاشرہ کے عمومی افعال و عواطف شدت سے کارفرما تھے - اقبال کا سال ولادت ۱۸۷۷ء اس تاریخی سال سے جو ۱۸۵۷ء کا عبرت ناک سال ہے ،

---

[1] - یہ بزرگ سید انور جعفری صاحب کے دادا تھے -

دور نہ تھا ۔ اگرچہ برطانوی راج کے تحت مغربی اثرات کافی عرصہ سے ریشہ دوانی کر رہے تھے ۔ لیکن ملک کا دامن بدستور ماضی ہی سے وابستہ تھا ۔ ملی نظام وہی دور اعتقاد کا نظام تھا جس میں ایقان و ایمان کی روح رچی ہوئی تھی ۔ حکومت ہر چند بدل گئی تھی لیکن معاشرے کا ڈھانچہ نہیں بدلا تھا ۔ قوم کا دل و دماغ ، اس کی روح ، روایات، اقدار اور طور و طریق بدستور وہی تھی بلکہ وہ راسخ العقیدگی جس نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے عروج کے خلاف جہاد و انقلاب کی ہیجان انگیز شکل اختیار کی تھی اب شدید سے شدید تر ہو گیا تھا ۔ جب کسی قوم پر کوئی ناگہانی افتاد آن پڑتی ہے تو وہ اپنی جمعیت کو برقرار رکھنے کے لیے بالعموم ماضی ہی کا سہارا لیتی ہے ۔ وہ اپنی اقدار اور روایات ہی کی طرف رجوع ہوتی ہے جنھوں نے اسے اتنا عرصہ برقرار رکھا ۔ وہ آزمودہ نسخے کو بار بار آزمانا چاہتی ہے ۔ اسی لیے اقتدار سے محروم ہونے پر مسلمانانِ ہند کو یقین تھا کہ ان کی تباہی کا باعث ترکِ مذہب کے سوا اور کچھ نہیں اور انھیں پھر مذہب ہی کو پشت و پناہ بنانا چاہیے ۔ ان کی بقائے ملی کا دار و مدار تمام تر احیائے مذہب پر ہے ۔ لہذا ۱۸۵۷ء کے بعد ساری کی ساری تحریک احیائے ملی ہی کی تحریک تھی ۔ اس کا زور دین ہی پر تھا ۔ سیاسی تحریکات ہوں یا سماجی و مذہبی سب کی غرض و غایت ایک ہی تھی اور اس دور میں بتقاضائے وقت تمام اقوامِ ہند میں ایسی متعدد تحریکات جاری ہوئیں ۔ اس دور کی سرگرمیوں پر نظر ڈالی جائے تو ہر کہیں انھی تحریکات کی وجہ سے ایک ہنگامہ برپا دکھائی دیتا ہے ۔ مسدس کی آواز تمام قوم کی آواز تھی ۔ مذہبی

مباحثے اور مناظرے ، ملی منظومات ، رسائل و جرائد ، مطبوعات ، ادارے تمام میں ایک ہی ہلچل دکھائی دیتی ہے ۔ ان کی تہہ میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہے ۔ قرون وسطیٰ کی بتہام و کہال بازیافت انھی خطوط کو دوبارہ ابھارنے کی جد و جہد ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ ایمان و عرفان ، زہد و ریاضت ، تصوف و سریان ، دینی عقائد ، روایت اور شعائر ، کشف و کرامات ، فقر و درویشی ، غیب و حضور ، معجزات اور ماورائی تصورات ، ملک کے در و دیوار انھی آوازوں سے گونج رہے تھے ۔ اقبال بالذات ان میں شریک اور ان سے متاثر تھے ۔ وہ نئے دور میں پرانے دور کے فرد تھے ۔ ان کی پیدائش انگریزی دور میں ہوئی لیکن ذہنی ملجا و ماویٰ دور کہن تہا جس میں صوم و صلواۃ زندہ حقیقت تھے :

لا الٰہ اندر نمازش بـود و نیست
نازہا انـدر نیازش بـود و نیست
نور در صوم و صلٰوات او نمـاند
جـلوۂ در کائـنات او نمـاند

یہ دور ظاہری طور پر ختم ہونے کے باوجود برابر جاری رہا ۔ پرانے نظامِ اعتقاد پر جدید اثرات کا ملمع تو چڑھ چکا تہا لیکن اس کے نیچے روایت کی تہہ برابر موجود تھی ۔ جدید علوم و فنون اور افکار و خیالات فروغ پا چکے تھے ۔ پھر بھی مذہب و تصوف کا بازار گرم تہا ، اور اربابِ سیادت زوالِ حکومت کا سبب ترکِ مذہب اور

---

۱ - جاوید نامہ ص ۲۳۴ -

ترکِ روایات ہی کو گردان کر دوبارہ شد و مد سے انھی کو اختیار کرنے کی تحریک دلا رہے تھے ۔ ایک بحرانی دور میں جب انتشار کی قوتیں شیرازۂ حیات کو درہم برہم کر رہی ہوں تو قوم کے دانشور اور اہلِ قلم یہی تلقین کر سکتے تھے کہ سیلاب کے سامنے مذہب ہی کا بند باندھا جائے ۔ ستون مرکزِ ثقل سے ہٹ چکا تھا ۔ اس لیے ضروری تھا کہ اسے پھر اپنی جگہ پر کھڑا کیا جائے ۔ اگر شیرازۂ ملت منتشر ہوا تو کوئی مرکزِ جمعیت بھی لازم تھا ۔ ایک ایسا محاذ جس سے مدافعانہ کارروائی جاری رکھی جا سکے ۔ بحث و تکرار کا ہنگامہ برپا تھا ، اور ہر فریق شد و مد سے اپنی حمایت میں سرگرم ۔ سرسید ، ابوالکلام اور دانشوروں ، ادیبوں اور علمائے دین کا ایک جمِ غفیر جہادِ ملت میں کوشاں تھا ۔ جو لوگ اس دور میں سے گزرے ہیں انھیں آئے دن جلسوں ، جلوسوں اور مناظروں کی ہڑبونگ یاد ہوگی ، اور ان ملی نظموں کی بھرمار بھی جن کی طرح مسدس نے ڈال دی تھی ۔

کشمکش کے اس دور میں اسلام کی ٹکر نصرانیت اور ہندو مذہب دونوں سے تھی ۔ ہندو مذہب کے ساتھ ساتھ ہندو جاتی سے بھی ٹکراؤ تھا جو مسلمانوں کی زبردست سیاسی و مذہبی مدِ مقابل بن کر سامنے آ گئی تھی ، اور آریا فرقے کے جارحانہ روپ میں ایک زبردست محاذ بنا کر مقابلے کے لیے تلی کھڑی تھی ۔ اس ٹکراؤ نے مسلمان مبلغین کو صف در صف میدان میں لا کھڑا کر دیا اور مذہبی مناظروں کی بھرمار شروع ہو گئی ۔ یہاں تک کہ نوبت مقابلہ اور مقابلہ سے گزر کر دعوئے نبوت تک جا پہنچی ۔ اقبال کا سارا خاندان ان عمومی

اثرات اور قادیانی تحریک سے متاثر تھا۔ کتنے ہی افراد نے بانیِ سلسلہ کی بیعت قبول کرلی تھی۔ یہاں تک کہ خود اقبال بھی ایک وقت اس پر آمادہ تھے اور بیعت ہوتے ہوتے رہ گئے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا مرزا صاحب کا تذکرہ کیا ہے وہ اپنے مضمون

The doctrine of absolute unity as expanded by Abdul Karim Al-Jilani.

میں لکھتے ہیں :

''اس سے فوراً ظاہر ہو جائے گا کہ مصنف نے کس قدر بین طور پر ہیکل کی جدلیت کی نمایاں صورت کا مدتوں پہلے ادراک کر لیا تھا ، اور لوگوس کے نظریے پر کس قدر زور دیا ہے۔ وہ نظریہ جو اسلام کے تقریباً تمام عمیق ترین مفکروں کے نزدیک مقبول رہا ہے ، اور موجودہ زمانے میں مرزا غلام احمد قادیانی نے جو ہندوستان کے جدید مسلم ماہرینِ دینیات میں سب سے زیادہ عمیق النظر ہیں ، اس کی دوبارہ حمایت کی ہے''
(انڈین اینٹی کویری ۱۹۰۰ء)

یہ اوائل عمر کا مضمون ہے۔ جب اقبال کی عمر تیسری دہائی کے بین بین تھی۔ بعد میں انھوں نے ایک مبسوط مضمون میں جو پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں لکھا گیا تھا ، مرزا صاحب کے دعوائے نبوت اور قادیانی تحریک کی شدید مخالفت کی ہے۔ لکھتے ہیں :

عصر من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآں بغیر از خود ندید

ہر یکے دانائے قرآن و خبر
در شریعت کم سواد و کم نظر[1]

''جاوید نامہ'' میں ارشاد ہے :

صحبتش با عصر حاضر در گرفت
حرف دیں را از دو 'پیغمبر' گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد
آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد[2] !

اس سے ظاہر ہے کہ اقبال اسلامی فکریات اور تاریخ و روایت میں، کس قدر گہرے ڈوبے ہوئے تھے - ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی زبان و ادب ، قرآن و حدیث ، فلسفہ و حکمت ، تفسیر و فقہ وغیرہ تمام علوم دینیہ ، معارف اسلامیہ اور کوائف ملیہ کے کن کن بعید گوشوں میں پہنچے ہیں ، اور انھوں نے کن کن ذرائع سے اثر قبول کیا ہے - عربی کی باقاعدہ تحصیل کے بعد دبستان علوم شرقیہ ، جامعۂ لندن میں فرائض مدرسی کی انجام دہی عربی زبان و ادب پر غیر معمولی دسترس کی آئینہ دار ہے - ان وجوہ سے اسلامیات کی حد تک اقبال کی شخصیت ایک مخزنِ علوم کی ہو گئی تھی جس میں فلسفہ و حکمت کے بسیط مطالعہ سے مسلسل اضافہ ہوتا رہا - ان کی حیثیت ایک ایسے زندہ حساس آلے کی تھی جس سے ماحول کے ہر پہلو کی طرف ایک مخصوص انداز میں رجوع ہونے کی توقع کی جانی چاہیے- گرد و پیش کے سارے ہنگامے ان کے دل و دماغ پر زور و شور

---

۱ - مثنوی ، ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' : ص ۳۱ .
۲ - جاوید نامہ ص ۲۳۵ -

سے دستک دیتے تھے۔ جس سے ان کا دل افکار و خیالات اور احساسات و کیفیات کا رستخیز بن جاتا تھا ، اور وہ اس کے پاسخ گزار ہوتے تھے ۔ کیا تحریک علی گڑھ اور دارالندوہ اور سیاسی و مذہبی ، فکری و تہذیبی تصادم کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی نہیں دیتی ۔ اور اس کے تموجات دور حاضر کے ساحل سے آآکر نہیں ٹکراتے ؟ خود پاکستان بھی جس کا نظریہ سرسید اور اقبال نے پیش کیا تھا ، اس دور کے ہیجانات کی پیداوار ہے ۔ اگر ہم آج بھی اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود متموج لہروں سے متاثر ہوتے ہیں تو اقبال جن پر یہ چاروں طرف سے محیط تھیں ان سے اثر پذیر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے ۔

تقاضائے وقت کے پیش نظر اس دور میں ملی امور کی پیش رفت کے لیے جا بجا انجمنیں قائم ہو گئی تھیں ۔ انجمن حمایت اسلام انھی میں سے ایک تھی ۔ لیکن پنجاب کے دل ، لاہور میں ہونے کی وجہ سے اس کی سرگرمیاں یہاں کے باشندوں پر براہ راست اثر انداز ہوتی تھیں ۔ اس کا ایک ضمنی مگر اہم پہلو یہ تھا کہ گرمئی محفل کے لیے شعراء کی ضرورت تھی جو اپنے نغمات سے سامعین کے دل کو گرما دیں اور روح کو تڑپا دیں ۔ اقبال اپنی پُر سوز لے اور قلبی احساسات کے سبب اس حدی خوانی کے لیے جو ناقے کو وجد میں لے آئے ۔ خاص طور پر سوزوں تھے اور انجمن حمایتِ اسلام ان کو نغمہ سرائی کے لیے مستقل مقام فراہم کرتی تھی ۔

اور اب جب ملک ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے باعث سیاسیات کا اکھاڑہ بن چکا تھا ، دوسروں کی طرح اقبال بھی ترانہ

ہندی ، سید کی لوح تربت اور شوالہ کی حد سے نکل کر ترانۂ ملی کے حدود میں داخل ہو چکے تھے ۔ ظفر علی خان کی ''ملتِ بیضا پر ایک نظر'' اس رجحان کی واضح علامت ہے ۔ اس کے لیے انجمنِ حمایتِ اسلام اور دیگر قومی اداروں کی کارروائیوں میں شرکت ایک مبرم تقاضا بن چکی تھی ۔ فریادِ ملت ، نالۂ یتیم وغیرہ اسی قبلہ رو ہونے کی آئینہ دار ہیں ۔

اس کے ساتھ ہی اقبال اپنے گھر اور شہر کی محدود فضا سے جو شعور لے کر نکلے تھے اس میں ملک کے بدلے ہوئے حالات کے باعث کچھ اور گنجائش بھی تھی ۔ ابتدا میں جیسا کہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے ، وہ غزلیات میں عشق و محبت ہی کے رومانوی گیت گاتے رہے ۔ ایک نوخیز فرد کی امنگوں کے ذاتی ترانے لیکن باہر کی کھلی فضا سے دوچار ہوتے ہی اصلیت نے آنکھیں کھول دیں ۔ ذہن سے خود بخود پردے اٹھنے لگے اور ملک کی نئی سیاسی فضا نے نیا احساس پیدا کیا ۔ ایک غیر قوم کے تسلط کے خلاف ابھرتا ہوا احساس جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے ۔ یوں بھی اقبال نے کھلے دل سے ہندو تہذیب کا مطالعہ کیا تھا اور اس میں کشش محسوس کی تھی ۔ بالخصوص اس لیے کہ دور کہن کے محبوب تصوف کی ہمہ اوستی اور ویدانت کے ڈانڈے آپس میں کافی ملتے ہیں ۔ اس کھلتی ہوئی فضا جس میں دیسی اور بدیسی (ہندی و فرنگی) عناصر دونوں شامل تھے ، کا عکس ''ہمالہ'' پر اس یادداشت (مطبوعہ مخزن) میں نظر آتا ہے جس میں ہندو اوتاروں کا ذکر کیا گیا ہے اور انھیں ملائکہ کا مترادف قرار دیا گیا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر کی

آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں ۔ ترانۂ ہندی ، نیا شوالہ ، ہندوستانی بچوں کا گیت ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہلِ وطن کے باہمی نفاق سے کس قدر آزردہ تھے ۔

مگر وہ وقت تیزی سے قریب آ رہا تھا جب کئی دوسرے دانشوروں ، سر سید اور قائدِ اعظم کی طرح وہ بھی حالات کی رفتار سے متاثر ہونے اور کسی مفاہمت کی بنا پر نہیں بلکہ محض حقیقت پسندی کے باعث ، واقعات کی ناگزیر منطق کے تحت اپنے خیالات کی نہج بدل ڈالیں ۔ یہ تغیر درحقیقت نئے شواہد و کوائف کے ساتھ موافقت پیدا کرنے کی کوشش تھی ۔ اس کی کیفیت بعینہٖ اس طرح تھی جس طرح سورج کے طلوع ہونے پر آہستہ آہستہ گہرے پردے اٹھتے جائیں اور زمین کے کھردرے کونے کھدرے ، نکیلی گھاٹیاں اور گہناؤنی کھائیاں اپنی چونکا دینے والی حقیقتوں کے ساتھ ابھرتی چلی آئیں اور انسان کے نقطۂ نظر کو اجاگر کر جائیں ۔ ایک کے بعد دوسرا افق طلوع ہو کر نئے حقائق کا انکشاف کرے اور ناظر اپنے زاویۂ نگاہ کو اس کے مطابق بنانے میں کوشاں ہو ۔

ادھر وقت کے ساتھ ساتھ برِ صغیر سے باہر کی دنیا اور اس کے حالات تیزی سے سامنے آنے لگے ۔ جہاں مغرب و مشرق کا تصادم اور اس کے نتیجے میں عالمی صورتِ حال آشکار ہوئی ، وہاں تاریخ کے دھارے بھی مل کر آفاقی نہج پر غور و فکر کے مقتضی ہونے ۔ اس فضا میں وطن کا خواب فراموش ہو گیا ، یعنی وطن بحیثیت سیاسی تصور کے ۔ حب الوطنی اپنی جگہ پر ہے لیکن وہ وطنیت یا نیشنلزم جو قومیت کے محدود تصور کو جنم دے ، قوموں میں نفرت ، رقابت اور

کشمکش پیدا کرے اور ایک قوم کو دوسری قوم کا تختۂ مشق بنائے ہرگز پسندیدہ نہیں۔ غلبۂ فرنگ کے مکروہ نتائج اقبال کے سامنے آئے جن کا سایہ اسلامی ممالک پر سب سے زیادہ تھا۔ مشرق کے زیردست ممالک کی سیاسی زبوں حالی بجائے خود اتنی غور طلب نہیں تھی جتنی یہ کہ قوموں کے تنزل و انحطاط کا حقیقی سبب کیا ہے۔ بقائے امم اور توانائی حیات کن امور میں مضمر ہے۔ مطلب یہ کہ اصل مسئلہ حیات کے حقیقی راز کی دریافت ہے۔ اگر ہمیں یہ نسخۂ کیمیا ہاتھ آ جائے تو نوعِ انسان کے حق میں نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوگا۔ کیونکہ ہم اس کی بدولت بہترین فلاحی نظام قائم کر سکتے ہیں۔

جہاں دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے، چند ممالک ہی نہیں بلکہ تمام آفاق مجموعی طور پر زیرِ غور آ جاتی ہے۔ اصلی مسئلہ اس صورتحال کا ہے جو مشرق و مغرب کے موجودہ تصادم سے رونما ہوتی ہے۔ تاریخی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایسے تصادم بارہا ہوئے ہیں۔ ایران اور یونان، روما اور مشرقِ وسطیٰ، اسلام اور یورپ میں شدید تصادم ہوئے۔ لیکن موجودہ تصادم ان سب سے زیادہ وسیع اور سنگین ہے۔ اس کے نتائج کہیں زیادہ متنوع اور ہولناک ہیں۔ اس کی نوعیت عالمگیر ہے۔ اس کی بنیاد نظریات اور تصورات پر ہے جن سے آئے دن نئے نئے شاخسانے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ محض معرکۂ کارزار نہیں بلکہ سیاست کا کھیل ہے۔ جس میں اسلحہ سے زیادہ حکمتِ عملی اور ہتھکنڈوں سے کام لیا جاتا ہے۔ علم و حکمت کی بدولت اسبابِ تباہی میں نت نئے اضافے ہوتے ہیں یہاں تک کہ اب

نوبت ایٹم بم ، شعاعِ مرگ اور گن رنز تک پہنچ چکی ہے - یہ تصادم وقتی نہیں ، روز افزوں ہے - اس کا سلسلہ لامتناہی ہے - یہ برائیوں کا ایک بے پایاں چکر ہے - جو برابر یک جہاں آشوب و یک محشر فتن کو جنم دئے جاتا ہے - لہذا اب ضرورت پیش آتی ہے کہ ہم اس تصادم کے اسباب کو سمجھیں اور معلوم کریں کہ یہ صورتحال کیوں اور کس طرح رونما ہوئی -

اول ، یہ قضیہ صرف مشرق اور مغرب کا قضیہ نہیں - یہ اتنا ہی مشرق و مغرب کا تصادم ہے جتنا مغرب کا مغرب کے ساتھ - کسی ملک کی اپنے ہی ساتھ آویزش نیز طبقاتی کشمکش - ایک نظام کا دوسرے نظام سے ٹکراؤ - نظریے نظریوں کے ساتھ سرگرم پیکار - ارتقا کا ہر قدم اپنے ساتھ کشمکش لایا ہے - جب انسان شکاری زندگی کو چھوڑ کر کاشتکاری کی طرف رجوع ہوئے ، جب چوپائی نظام زرعی نظام میں تبدیل ہوا ، جب زرعی نظام کی جگہ کلی نظام نے لے لی اور اب مشینی نظام کی جگہ تالکاری نظام رونما ہو رہا ہے - تو ان سب سے جو بنیادی قسم کی کایا پلٹ ہوتی ہے ، اس سے معاشرہ درہم برہم ہو جاتا ہے - فرد کے فرد اور جماعت کے جماعت کے ساتھ مفادات ٹکراتے ہیں اور کہیں مدت میں جا کر ٹوٹے ہوئے رشتے کسی نہ کسی طرح جڑ جاتے ہیں اور شاید پھر بھی کوئی نہ کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے -

ان انقلابوں میں سب سے پرشور انقلاب صنعتی انقلاب ہے جس سے مشینی دور کا آغاز ہوا - یہ محض اتفاق ہے کہ اس کا ظہور

یورپ میں ہوا ورنہ یہ جہاں بھی ہوتا وہاں ویسے ہی حالات رونما ہوتے جیسے یورپ میں ہوئے - سماج ، اس کے اوضاع و اطوار ، اقدار ، کاروبار ، معیشت ، سرمایہ داری ، طبقات کی باہمی کشمکش ، سرمایہ و محنت کے گورکھدھندے ، شہروں اور دیہاتوں میں رد و بدل ، خاندان کی ادھیڑ بن ، انسانی رشتوں (مرد و زن ، اولاد اور والدین ، دیہی و شہری اور طبقات) میں الٹ پھیر ، قومیتیں اور اوطان ، منڈیوں کے لیے دوڑ دھوپ اور مسابقت ، جوعِ ارض ، فتح و تسخیر ، استعمار ، دولت اندوزی ، جنگ و جدل وغیرہ وغیرہ - یہ سب صنعتی انقلاب ہی کے کرشمے ہیں - ول ڈیوراں نے ''ایوانات فلسفہ'' میں اس انقلاب اور جدید نظامِ اخلاق پر جو مبسوط باب تحریر کیے ہیں ان سے اس تہلکہ آفریں زلزلے کے سارے پہلو ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں اور اب جب سائنس اور ٹکنالوجی نے انسان کو ہر طرح کے بے پناہ آلات و ایجادات اور دریافتوں سے لیس کر دیا ہے - انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ریشہ دوانی اور بھی بڑھے گی اور افراتفری کا بیش از پیش دور دورہ ہوگا - قدرتی بات تھی کہ جب سرمایہ داری سے گوناگوں بدعنوانیاں پیدا ہوئیں تو ان کی اصلاح اور سدِ باب کے لیے اشتراکیت کا ظہور ہوا اور اپنی جنم بھومی ، یورپ تو درکنار یہ دیکھتے ہی دیکھتے بن کی آگ کی طرح تمام دنیا میں پھیل گئی - ہر کہیں 'جو نقشِ کہن آئے نظر اس کو مٹا دو' کے انقلاب آفریں نعرے بلند ہونے لگے - ملک ملک میں کایا پلٹ ہوئی اور آفاقی پیمانے پر بگل بجنے لگے - دو تباہ کن عالمی جنگوں کے بعد اب تیسری ہولناک جنگ کے اسباب پوری طرح فراہم ہیں جن کی تمہید ، چھوٹے

پیمانے پر خوں ریز جنگیں ، جا بجا برپا ہیں ۔ غرض جدید دور بحرانوں پر بحرانوں اور تہلکوں پر تہلکوں کا دور ہے ۔

ذہن تمام تر مادہ اور ظرفیات کی پیداوار ہو یا نہ ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ انسان آج سے ہزاروں سال پہلے غاروں اور جنگلات کے جن دھندلکوں میں زندگی بسر کر رہا تھا ان سے قدرت کی قہرمانی قوتوں ہی کا احساس ابھر سکتا تھا جنہیں قدر و قضا کہا جاتا ہے ، اور زمین پر آسمان کا سایہ محیط تھا ۔ اس لیے جو بھی نازل ہو ، خواہ وہ آفات و بلیات ہوں یا الہامات ، آسمان سے زمین کی طرف رخ کرتے تھے ۔ اب جب دھندلکوں کی جگہ روشنی نے لے لی ہے اور آسمان نہ اس قدر عظیم ہے نہ مہیب ، اور زندگی زمین پر آزاد بھی ہے اور آسودہ بھی ، ذہن کا رخ قدرتی طور پر آسمان سے زمین کی طرف پلٹ گیا ہے اور علوی نظریات کی جگہ سفلی نظریات نے لے لی ہے ۔ اسی لیے آج کل کارل مارکس کے مادی نظریے کو مذہب کی حیثیت حاصل ہے ۔ دریں حالات سابقہ فضا سے جو بھی ذہن ابھرے گا وہ اس نئے تصور سے گریزاں ہوگا ۔ فلسفہ میں عینیت کا قائل قدرتی طور پر مادیت کو تمام تر کفر قرار دے گا ۔

صنعتی انقلاب یکایک رونما نہیں ہوگیا تھا ۔ یہ صدہا سال کی تاریخی پخت ویز کا نقطۂ عروج تھا ۔ اس کا آغاز کہنے کو یونان و روما کے تہذیبی اثرات سے ہوا لیکن درحقیقت اس کا سب سے فعال عنصر اسلام تھا ۔ اس سے اہلِ مغرب میں ایک نیا شعور پیدا ہوا ۔ مسلمان اپنے ساتھ دینی تعلیمات اور طرزِ زندگی میں مشرق کے علم و حکمت کے خزانے بھی سمیٹ کر لائے تھے جن کی روح تحقیقی و

تجرباتی تھی ۔ انھوں نے اپنے والہانہ ذوق و شوق میں ارسطو کے مردہ فنون کو جگایا اور حیات و کائنات کو لبیک کہنے کا جذبہ پیدا کیا ۔ قاعدہ ہے کہ دئیے سے دیا جلتا ہے ۔ ہر تہذیب سابقہ تہذیبوں کا حاصل ہوتی ہے اور ان کے سرمایۂ علم میں توسیع و اضافہ کرکے اسے دور دور پھیلاتی ہے ۔ اسلامی تہذیب اپنے وقت کی سب سے جامع اور ترقی یافتہ تہذیب تھی اس لیے اس نے قدرتی طور پر یورپ کو نئی روشنی بخشی اور عقل و فہم کو چراغ راہ بنانے کی تحریک دلائی ۔ لہذا یورپ نے اسلام ہی کی نہج پر قدم بڑھایا ہے ۔ بظاہر نصرانیت کا پیرو ہونے کے باوجود اس کی روح حقیقۃً اسلام کی ثقافتی روح ہے ۔ وہ ذہنی پخت و پز جس کا آغاز اسلامی، اور اس کے زیر تحت یونان اور روما کے احیائی اثرات سے ہوا، رفتہ رفتہ تحریک اصلاح، نشاۃ الثانیہ اور انقلاب فرانس پر منتج ہوئی ۔ یہاں تک کہ نئی ذہنی بیداری صنعتی انقلاب کا باعث ہوئی ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ دیگر عوامل نے بھی اہم کردار کیا مثلاً میکاولی کا نظریۂ سیاست جس کا اصل الاصول مکر و فریب اور چالبازی ہے ۔ اس نے دنیاداری کی راہ دکھائی اور فکر مغرب خصوصاً ارباب جاہ (بقول اقبال نردان فرنگی) کی ذہنیت کو جن کے ہاتھ میں عنان اختیار تھی اور پاپائیت کے علی الرغم تمام اقتدار ہتھیانا چاہتے تھے، ایک خاص رجحان عطا کر دیا اور قرون وسطیٰ میں اشرافی نظام یورپ پر مسلط ہوگیا ۔ اس کا نتیجہ بڑی بڑی مملکتیں تھیں جنھوں نے رفتہ رفتہ جداگانہ قومیتوں کی صورت اختیار کر لی ۔ اقبال اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"لوتھر نے مغرب کے کلیسائی نظام کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ لیکن یورپ کے مخصوص حالات کی وجہ سے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت مسیح کا عالمگیر اخلاقی نظام درہم برہم ہو کر اس کی جگہ بے شمار قومی، اور اس لیے تنگ تر قسم کے اخلاقیات ظہور پذیر ہوئے۔ اس طرح روسو اور لوتھر وغیرہ نے جو ذہنی تحریک جاری کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ریاست کی جگہ متعدد بے طور ریاستیں رونما ہوئیں۔ انسانی نقطۂ نظر نے جنم لیا جس کے لیے کوئی نہ کوئی مادی بنیاد درکار تھی۔ مثلاً ملکی علاقے، اور جس نے قومی نہج پر ترقی کرتے ہوئے مختلف حکومتی نظاموں کی شکل اختیار کی جس کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی استحکام تمام تر علاقہ جات پر موقوف ہے۔ ایسا ہونا لازم تھا کیونکہ جہاں بھی یورپ کی طرح پراٹسٹنٹ قسم کا مذہب رائج ہوگا۔ وہاں عالمی نظام اخلاق کی شکست و ریخت سے محدود نظامِ اخلاق و تمدن ہی رونما ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں مذہب کو انسانوں کا نجی معاملہ ٹھہرایا گیا ہے۔"

یورپ نے روح و مادہ کی کی جدائی کو تسلیم کر لیا ہے جس کی خرابی اس کے بہترین مفکر آج محسوس کر رہے ہیں لیکن اس کے سیاست دان اسے ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر بالواسطہ تمام دنیا پر ٹھونس رہے ہیں۔ یہ اسی رجحان کا نتیجہ ہے جس نے یورپ کی مذہبی و سیاسی فکر پر شدید اثر ڈالا ہے۔ اور اسی کے باعث نصرانیت مغربی ریاستوں کی زندگی سے بالکل خارج ہو چکی ہے۔

جداگانہ قومیتوں کے معنی ہیں اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا ، جداگانہ مفادات ، باہمی رقابتیں ، کشمکشیں ، تصادم اور وہ تمام باتیں جو وطنیت کے سیاسی تصور سے وابستہ ہیں ۔

یورپ میں انسانیت کی تحریک بڑی حد تک اسلامی افکار کی پیدا کردہ نوتوں کا نتیجہ تھی ۔ اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ تحریک انسانیت سے جو مغربی علوم جدیدہ اور فلسفہ و حکمت وجود میں آئے ہیں ، وہ کئی اعتبار سے اسلامی تہذیب کی ترقی یافتہ صورت ہیں ۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب اسلامی علم و حکمت کا سرمایہ بتمام و کمال سامنے آئے ۔ مغربی علم و حکمت کا معتدبہ حصہ اسلامی ثقافت ہی سے رونما ہوا ہے ۔ مثلاً آئن سٹائن کے نظریے سے ملتے جلتے نظریۂ اضافی پر اسلام کے علمی حلقوں میں بڑی شد و مد سے بحث ہوتی رہی (ابوالمعالی بحوالہ ابن رشد) ۔ اسی طرح منطق جدید کا سارا سلسلہ رازی کے استخراجی منطق پر اعتراض سے وجود میں آیا ۔ اسی بنا پر اقبال نے اپنے مضمون A Plea for the Study of the Muslim Scientists میں اسلامی علوم کی چھان بین پر زور دیا ہے ۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ابن خلدون ، البیرونی ، ابن الہیثم ، ابن حیان وغیرہ کے یہاں جدید سائنس کے کتنے ہی ابتدائی نقوش ملتے ہیں ۔ علیٰ ہذا قانون اور انسیات میں بھی پیشرو تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔ ہابس ، لاک اور روسو کا مشہور نظریۂ میثاق اسلامی نظریۂ میثاق ہی کا مغربی روپ ہے ۔ فلاحی ریاست ، حکومت برائے عوام اور فرد و جماعت کے رابطۂ باہمی کے اصل الاصول کی جڑیں کسی بھی بے لاگ تجزیے کے مطابق

اسلامی دساتیر ہی میں پیوست ہیں - ریاست ، مدنیت اور عمرانیات تمام اسلامی مفکروں کا نمایاں مبحث رہے ہیں جن کے متعلق کتنے ہی نظریات پیش کیے گئے ہیں - یہاں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں - تاہم ایک چھوٹی سی بات جو دلچسپی سے خالی نہیں : مغربی شاعری میں تقطیع کے لیے چھوٹے بڑے ج صوتوں کے لیے جو علامات (ــ ن) مقرر ہیں ، البیرونی کی 'کتاب الہند' میں (ــ ہ) کی علامات ان کی بالکل ہم وضع ہیں - ایسے بدیہی حقائق کا اعتراف بعض اہلِ مغرب نے بھی کیا ہے - انھی امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نیٹشے نے افسوس ظاہر کیا تھا کہ نصرانیت نے اہلِ مغرب کو اسلامی ثقافت سے کماحقہ' مستفید ہونے سے محروم رکھا -

کیا مغربی سائنس اپنے ماٰخذ میں تمام تر مغربی ہے ؟ یہ کہنا مشکل ہے لیکن یہ اس حد تک یقیناً درست ہے کہ اسلامی تہذیب نے علم و حکمت کی جو آبیاری کی تھی اور اس سے ایک عظیم فصل پیدا کی تھی ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حیات و کائنات پر تدبر ، تحقیق ، مشاہدہ اور استفسار کی جو ذہنیت پیدا کی تھی ، مغربی علم و حکمت کی اساس ثابت ہوئی -

انسانیت میں واقعۂ معراج نے جو عمیق اور دور رس اثر ڈالا ہے اس کے بے شمار شواہد ملتے ہیں - معراج میں یقیناً مذہبی تصور کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوگا جس کی وجہ سے یہ دانتے کے لیے اتنا پُرکشش ثابت ہوا - اور ابن العربی کے ذریعے طریقۂ خداوندی کے اس اعلیٰ ترین حصہ کا نمونہ ثابت ہوا جو قرونِ وسطیٰ کی تہذیب کا آئینہ دار ہے - یہ امر بوالعجبی سے خالی نہیں کہ نصرانیت کا

شاعر اعظم اپنے افکار میں اس قدر اسلامی ہو ۔ اسلام کی حیثیت دراصل تاریخ میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح تھی کہ اس کے بغیر ارتقائے انسانی کس طرح قابلِ فہم نہیں ۔ بلا شبہ اسلامی ثقافت مغربی تہذیب کی پیشرو ہی نہیں ، پیش خیمہ بھی تھی ۔ اور ایسا ہونا تاریخی اعتبار سے لازم تھا ۔

صنعتی انقلاب نے سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ لگایا ۔ قومیت اور وطنیت نے پاؤں پھیلانے شروع کیے کیونکہ اب مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیوں کی تلاش ہوئی ۔ سرمایہ دار ، صنعتوں کے کپتان اور ملک التجار اپنا چہیتا کھیل کھیلنے لگے ۔ مقابلے کی دوڑ شروع ہوئی ۔ تجارت کی گرم بازاری نے ہوس کو بڑے بڑے تیکنے اور نوکیلے پر اور پنجے لگا دیے ۔ حصولِ زر اور جلب منفعت کا ضبط دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا ۔ دندان آز تیز ہوئے اور جب گھر کا میدان ناکافی ثابت ہوا تو بیرون نجات کو چنگل میں لانے کا جنون سوار ہوا ۔ فتح و تسخیر کے لیے تاخت و تاز شروع ہوئی ۔ سائنس نے نئے نئے تباہ کن سے تباہ کن ہتھیار فراہم کیے اور دوسری قوموں کو تیغ و تفنگ کا ایندھن بنایا گیا ۔ علاقوں پر علاقے اور ملکوں پر ملک ہتھیائے جانے لگے تاکہ فاتح قوموں کا بول بالا ہو ۔ جس کا اقتدار اور مقبوضات زیادہ وسیع ہوں ، وہی سب کا سرخیل قرار پائے ۔ دنیا کے نتنے ہی وسیع و عریض حصے خالی پڑے تھے یا آنے والے طوفانوں سے بے خبر تھے ۔ ان پر بے محابا یلغار سے کئی نئے شکار ہاتھ آئے ۔ دوسرے ممالک کھپانے ، استعمال کا جال پھیلانے اور نفع میں ہاتھ رنگنے کا موقع ملا ۔ اقتدار اور حکومت کا طرۂ افتخار الگ تھا اور سلطنت

کی توسیع دن دگنی رات چوگنی ترقی بے اندازہ شان و شوکت اور ملوکانہ عز و جاہ کے سامان فراہم کرتی تھی اور کون نہیں جانتا کہ صاحبانی اور عیش و عشرت کی فراوانی آپس میں لازم و ملزوم ہیں -

یہ تھا وہ مغرب جو اقوامِ عالم میں ایک نئی طاقت بن کر ابھرا تھا - جس نے دنیا کو زیرِ نگیں کرنے کا تہیہ کیا - جس کا مطمح نظر تسخیر بھی تھا اور سوداگری بھی - اور ان کے ذریعے عالمگیر حکمرانی اور سرداری - علم و حکمت اس کا آلۂ کار بھی تھے اور ممد و معاون بھی - گوناگوں ترقی یافتہ ساز و سامان اور آلات حرب سے لیس ، اسے ملوکیت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی - اس میں ایک نوخیز ، تازہ دم تہذیب کی بھرپور توانائی تھی کیونکہ حریف قومیں نڈھال ، پسماندہ اور انحطاط پذیر تھیں - ان کے جوہر اپنی میعاد پوری کر چکے تھے اور ان میں نئے طور پر مزید ارتقا کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی -

ان حالات میں مغرب کی سفید فام اقوام میں نسلی برتری کا احساس پیدا ہونا لازم تھا - نسلوں میں نسل اور تہذیبوں میں تہذیب مغربی ہے اور بس ، دوسری قومیں اور ان کی تہذیبیں پست اور ہیچ ہیں - قدرت نے اہلِ مغرب ہی کو یہ شرف عطا کیا ہے کہ وہ اپنی مایۂ ناز تہذیب کو تمام دنیا میں پھیلائیں - یہ ان کا فریضہ ہے جسے انہوں نے ''سفید اقوام کا پشتارہ'' قرار دیا - اس پشتارے کے حاملین میں نصرانیت کا نقیب کلیسا بھی شامل تھا تاکہ مذہب کی آڑ میں کاروبارِ حیات کو فروغ دیا جائے - یہ آدم گری نہیں بلکہ پردۂ تہذیب میں آدم دری ہے -

تصویر کو مزید اجاگر کرنے کے لیے ان افکار و نظریات کا تذکرہ بھی لازم ہے جن سے جدید مغرب کی ذہنی و فکری کیفیت نمایاں ہوتی ہے اور جس کا بالواسطہ اور بلاواسطہ ہر کہیں اثر مرتب ہوتا ہے ۔ مختصراً انیسویں اور بیسویں صدی مغرب کے علوم جدید کا دور ہے جس میں سائنس کے ہر شعبے ۔ نباتیات ، حیوانیات ، طبیعیات ، علم کیمیا ، برقیات ، میکانیات ، فلکیات وغیرہ نیز فلسفہ ، علم النفس ، عمرانیات ، جغرافیات ، مذہبیات اور الٰہیات میں گوناگوں خیال افروز حقائق و بصائر کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ اس سلسلے میں بیکن ، ڈارون ، آئن سٹائن ، برگسان ، نیٹشے ، روسو ، کارل مارکس ، فرائیڈ اور بے شمار ارباب علم کا نام ہی لے دینا کافی ہے جنھوں نے خود مغرب میں بھی قلب ، ماہیت پیدا کر دی ہے ۔ یہاں تک کہ الٰہیات اور روحانیت کا تقدس بھی تحقیق و تنقید کی نشتر زنی سے محفوظ نہیں رہا ۔ بقول اکبر : ”ہے ازل بھی تجربے کے زیر فرماں ان دنوں !“ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں نئے افکار و نظریات نے قلب ماہیت نہ پیدا کر دی ہو ۔ اور نتیجتہً مغرب کے ہر فرد کی ذہنیت کو ایک خاص وضع عطا نہ کر دی ہو ۔ مغرب کا جدید طرز زندگی اپنے تمام لوازمات کے ساتھ انھی نئے تصورات اور رجحانات کی پیداوار ہے ۔

ایک تاریخ دان کا قول ہے کہ مشرق ہمیشہ تلوار رہا ہے اور مغرب سپر ۔ آخری بار تلوار مسلمانوں کے ہاتھ حرکت میں آئی اور اس کا ردِ عمل مغرب کی مشرق پر موجودہ یلغار ہے جس سے تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے ۔

مشرق اس طوفان سے جو اس پر ٹوٹنے والا تھا بے خبر تھا ۔ اس کے ذہن پر اپنی برتری کا احساس چھایا ہوا تھا ۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سات سمندر پار بسنے والی قوم یا قومیں اسے کوئی نقصان پہنچا سکتی ہیں ۔ مسلمان دست بدست جنگ میں بارہا اپنی شمشیر کے جوہر دکھا چکے تھے ۔ کیا صلیبی محاربات میں جب سارا یورپ اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا تھا ، انھوں نے اس کو زک نہیں دی تھی ؟ پرامن طور پر اہلِ مغرب یا مبلغ بن کر آئے یا تاجر ، بہرحال وہ بے ضرر تھے ۔ خلافِ توقع وہ برِ صغیر میں اپنے تدبر سے غالب ہوئے اور مغربی تاجروں سے حکمران بن گئے ۔ دوسری مغربی قوموں ، پرتگیزوں ، ولندیزوں اور فرانسیسیوں نے بھی کہیں نہ کہیں تسلط جما لیا اور اپنی اپنی قلمرویں قائم کر لیں ۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ملک گیری کا ایک اور زبردست محرک پیدا ہوا ۔ صنعتی ترقی کے سبب کارخانے دھڑادھڑ مال تیار کرنے لگے اور ان کے لیے منڈیوں کی ضرورت پیش آئی ۔ اس کی سہل ترکیب یہ تھی کہ ملکوں پر ملک تسخیر کیے جائیں جو مال کی کھپت کے لیے خود بخود منڈیاں بن جائیں ۔ ایک پنتھ دو کاج ، حکومت کی حکومت اور تجارت کی تجارت ۔ یہ خیال آتے ہی ملک گیری کی ہوس دامنگیر ہوئی ۔ تجارت نے حکومت کا روپ دھارا اور ایشیا ، افریقہ ، آسٹریلیا میں جو جگہ بھی نظر آئی ، اسے ہتیا کر نوآبادیاں قائم ہونے لگیں اور مقامی لوگوں کو زیر کر کے حکومتیں قائم کی گئیں ۔ رعایا کو دبانے اور کچلنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے برتے گئے ۔ سیاست اور تدبر کا ہر حربہ کام میں لایا گیا ۔ بستیوں کو اجاڑنے اور مقامی

صنعتوں کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا ۔ مال و دولت لاد لاد کر وطن بھیجا جانے لگا ۔ اہلِ مغرب کی کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح باشندوں کو زیردست ہی رکھا جائے ، ان کو غلامی کا خوگر بنا دیا جائے ، ان کی صلاحیتیں مسخ کر دی جائیں ۔ ان میں جذبۂ آزادی کی رمق تک باقی نہ رہے ۔ وہ کسی طرح آپس میں متحد نہ ہوں ۔ حکومت کا زریں اصول ہے : پھوٹ ڈالو اور راج کرو ۔ یہی حکمتِ عملی شد و مد سے اختیار کی گئی ۔ تعلیم بھی دی جاتی تو ایسی کہ پڑھ لکھ کر سرکاری نوکر بن جائیں ۔ یعنی نوکر شاہی کے بے جان کل پرزے ۔ ان میں کوئی بیدار مغزی ، روشن خیالی ، آزادی کا جذبہ یا زندگی کی تڑپ نہ ہو ۔ وہ بصیرت سے معرا ہوں ۔ انہیں دن رات محنت مزدوری اور روزگار ہی کی فکر دامن گیر رہے ۔ اس میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے کہ وہ اپنے دین دھرم کو چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار کر لیں یا اپنے آبائی مذہب ، روایات ، اقدار اور طور و طریق سے برگشتہ ہو جائیں ۔ ان کا ماضی سے پیوند کٹ جائے اور وہ بے سرو پا زندگی بسر کرنے لگیں جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہیں ۔ ان کا اپنا کوئی نصب العین نہ ہو بلکہ وہ سر تا سر دوسروں کے تابع اور دست نگر ہوں ۔ ان کا مفاد اسی میں ہو کہ محکوموں کی حیثیت پالتو جانوروں کی ہو جو دوسروں ہی کے لیے جیتے ہیں ، انھی کے لیے اپنا تن من بیچ کر دن رات کام میں جتے رہتے ہیں اور حد یہ کہ مرتے بھی انھی کے لیے ہیں ۔

محکومی بجائے خود ایک مرض ہے جو ذہنیت کو مسخ کر دیتی ہے ۔ 'پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند' کی طرح 'غلامی و صد

عیب' بھی ایک بین حقیقت ہے ۔ غلام خود بخود آقا کی ہر بات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے اور اس کی ریس کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اس کی زبان ، لباس ، عادت و خصائل ، اوضاع و اطوار ، دین و مذہب ، عقاید و خیالات اور تہذیب و تمدن اس قدر پرکشش ثابت ہوتے ہیں کہ وہ ان کو اپنانے پر فخر محسوس کرتا ہے اور انہی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اوپری باتیں ہی حکمران قوم کی عظمت کا باعث ہیں ۔ جہاں حکام خطابات اور انعام و اکرام سے نوازتے ہیں وہاں مادی خواہشات و اغراض اور حصولِ عز و جاہ کی تمنائیں بھی دل کو ابھارتی ہیں اور انسان خود بخود خوشامد اور جی حضوری کا عادی بن جاتا ہے جو احساس کمتری کا لازمی نتیجہ ہے ۔ یہ غلامانہ ذہنیت رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ بڑے بڑے دیندار ، عمامہ پوش ، متقی و پرہیزگار بزرگ اور علمائے دین بھی ایمان فروشی پر اتر آتے ہیں اور مطلب برآری کے لیے دین کو مسخ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

رعایا کی حالت بدیشی حکومت کے تحت مردہ بدست زندہ کی ہوتی ہے ۔ اس لیے لوگ آپ ہی آپ نئے پن کے شوق میں ولایتی کارخانوں کا مال خریدتے اور اس پر پھولے نہیں سماتے ۔ سب مال دساور سے آئے تو ان کی اپنی صنعتیں کیونکر پنپ سکتی ہیں اور عوام کیسے خوشحال ہو سکتے ہیں ۔ ان کی ساری جمع پونجی دوسروں کی نذر ہو جاتی ہے اس طرح غلامی کی زنجیریں مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہیں ۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ یورپ میں بھی قدیم و جدید نظاموں کا ٹکراؤ ہوا تھا ۔ جس سے انقلاب آفریں نتائج رونما ہوئے تھے ۔ ساتھ ہی قدیم تصورات کا بند ٹوٹ کر ایسے نئے نئے نظریے اور رجحانات پیدا ہوئے تھے جنھوں نے ایک نئی ذہنیت کو جنم دیا ۔ تشکیک ، تحقیق ، جرح ، تنقید ، استفسار ، یہ تھیں نئے شعور کی خصوصیات ۔ اگر ان تمام مؤثرات کو مجموعی طور پر لیا جائے تو انھیں سیاست ، دستور و آئیں ، تہذیب و تمدن اور بوقلموں افکار و خیالات کا مجموعہ قرار دینا چاہیے جو مرکب شعور کی صورت میں عالم مشرق پر محیط تھا ۔ مشرق و مغرب ایک بار پھر ایک ہی سنگم پر جمع ہوئے تھے اور ان میں داد و ستد کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا تھا جس میں پلے کا جھکاؤ مشرق کی طرف تھا ۔

دل و گداز اور شکست و ریخت کی یہ کیفیت کسی ایک ملک تک محدود نہ تھی ۔ تہذیب فرنگ کی حیثیت ایک تاب کار جوہر کی تھی کہ جس چیز کو چھو جاتی وہ پارہ پارہ ہو جاتی ۔ سائنس ، فلسفہ ، علم النفس ، علم الاقتصاد اور قوم و وطن کے پر سوز نظریوں میں یوں بھی توڑ پھوڑ کے بے پناہ طوفان چھپے ہوئے تھے ۔ قبل ازیں سب سے بڑی طاقت جو میدان میں تھی ، دنیائے اسلام تھی جو اس حد تک متحد تھی کہ تمام اسلامی ممالک خلافت عثمانیہ کی افضلیت تسلیم کرتے تھے ۔ لیکن جب قومیت کے تصور نے زور پکڑا اور اہلِ مغرب نے اس کو ہوا دی تو اسلامی وحدت کا یہ مظہر دیرینہ اس کی تاب نہ لا سکا ۔ عربوں کی بغاوت نے اسلامی صفوں میں انتشار پیدا کر دیا اور دنیائے عرب بھی علیحدہ علیحدہ ملکوں میں

بٹ کر رہ گئی ۔ اگر کچھ کسر رہ گئی تو پہلی جنگ عظیم کے بعد فاتح مغربی اقوام نے جو حصے بخرے کیے ان سے نہ صرف عرب ممالک کی آزادی سلب ہو گئی بلکہ وہ ٹکڑیوں میں بٹ بٹ کر علیحدہ علیحدہ ملکوں کی صورت میں زیرِ اقتدار آ گئیں ۔ جمعیت اقوام قائم ہوئی تو وہ بھی کیا تھی ۔ اقوام غالب کا آلۂ کار جس کا کام زیردست اقوام کو تختۂ مشق بنا کر بالا دست قوموں کو انعام و اکرام سے نوازنا تھا ۔ افریقہ کا بیشتر حصہ سفید فام اقوام کے تصرف میں آیا اور مقامی سیاہ فام قومیں ان کا صیدِ زبوں بن گئیں ۔ گوری نسلوں کا ڈنکا جا بجا بجنے لگا اور استعمار کی کا جال جگہ جگہ پھیل گیا ۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کارخانوں کے لیے سستے مزدور حاصل کرنے کے لیے بدنصیب سیاہ فاموں کی بردہ فروشی نے زور پکڑا اور ان پر بے پناہ مظالم توڑے گئے ۔

اس تمام دور کی تاریخ ایسے ہی خوں چکاں سانحات سے پُر ہے ۔ برما ، چین اور جزائر شرق الہند جیسے بعید علاقے بھی طوفان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے ۔ اس طرح غلبۂ فرنگ سے جو صورت حال رونما ہوئی وہ عالمگیر تھی ۔

اقبال کی حیثیت ایک ایسے فرد کی ہے جو اس شدید بحرانی دور کے درمیان گزرا ۔ وہ مشرق میں پیدا ہوا ۔ جدید تعلیم پا کر اولاً یہیں مغربی اثرات قبول کیے ۔ اور پھر ایک عرصہ یورپ میں قیام پذیر ہو کر اس کا براہ العین مشاہدہ کیا ۔ علمی فیضان سے بہرہ ور ہوا ۔ مغربی تہذیب و تمدن اور افکار و خیالات کی گہرائیوں میں اترا اور اس بھرپور شناسائی کے باعث مغرب پر اظہار رائے کیا۔

اس کی دلچسپیاں اور ہمدردیاں اپنے تصور کے مشرق سے وابستہ ہیں - وہ اس کا ہوا خواہ ہے - جو ممکن ہے فطری انس اور علاقہ مندی کے شائبہ سے خالی نہ ہو - تاہم وہ اس پر بھی تبصرہ سے گریزاں ہے - زادۂ مشرق ہونے کی وجہ سے اس کی مشرق دوستی قابل فہم ہے - وہ اس کا ترجمان بھی ہے اور نقیب بھی -

ایک ذہین، ذکی الحس انسان کی حیثیت سے جو چشم نگراں بھی رکھتا ہو اور دیدۂ بینا بھی، اقبال قدرتی طور پر ان نئے نئے چونکا دینے والے حالات سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہوئے - ان کا ردِ عمل زیادہ شدید تھا - ان کے پس منظر نے قبول و رد کے عمل کو ناگزیر بنا دیا تھا -

کیا وہ مغرب کے بارے میں بے لاگ ہیں ؟ ہر فرد کے دل میں یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوگا - جہاں تک مغرب کا تعلق ہے عجب نہیں اس میں مشرق کی پاسداری کا شائبہ نظر آئے - وہ مغرب کے خلاف ہیں لیکن ساتھ ہی اس کا اقبال بھی کرتے ہیں - افکار میں جتنا فیضان مشرق کا ہے اتنا ہی مغرب کا بھی ہے - وہ مغرب کے مبصر ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں شواہد اور دلائل بھی پیش کرتے ہیں - اور جب ہم ان کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو یہ انسانی تضادوں ہی سے ابھرتی ہیں - تاہم جغرافی اور پیدائشی علائق کی بنا پر طبعی جھکاؤ ایسی بات نہیں جسے کلی طور پر نظر انداز کیا جا سکے - فطری فیصلہ نفسِ تنقید پر آ رہتا ہے - اور اس بارے میں کچھ عجب نہیں اہلِ مغرب کی رائے مختلف ہو - بعض نے کھل کر اس کا اظہار بھی کیا ہے - ان کی رائے میں احوال

مغرب کو اندرونی ناظر کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس میں روحانیت کی روشن علامات اور مظاہر دکھائی دیں گے جو اقبال اپنے ذہنی حجاب اور تقدیس مشرق کی وجہ سے مشاہدہ نہیں کرتے ۔ اس سلسلے میں بعض اہلِ مغرب بھی اس کے شریکِ فکر ہوں تو یہ ان کے خلوص و صداقت کی تقویت کا باعث ہوگا ۔ سوال مشرق کی مغرب پر نکتہ چینی کا نہیں بلکہ اعلیٰ انسانی مفادات کا ہے ۔ اگر کوئی مغربی مفکر مشرق کو ہدفِ تنقید بنائے تو وہ بھی یکساں طور پر قابلِ لحاظ ہوگا ۔ خود مغربی دنیا اپنی تہذیب کے بارے میں وجدانی احساس سے خالی نہیں رہی ۔ برٹرانڈ رسل ، اسپنگلر ، جے ۔ بی ۔ پریسٹلے ، سی ۔ ای ۔ ایم جوڈ وغیرہ نے تصویر کا تاریک رخ اجاگر کیا ہے جو اقبال کے پیش کردہ رخ کے مشابہ ہے ۔ ول ڈیوران ''ایواناتِ فلسفہ'' میں لکھتا ہے کہ

''ہیلانی تہذیب الزادی تھی ۔ اس نے حقیقت کی تلاش چھوڑ دی اور خوئے تسلیم پیدا کرلی ۔ اس نے فن کے لذائذ اور لطائفِ تفنن کا مطالعہ شروع کر دیا اور ایک جاں بلب دنیا کے موسمِ خزاں کی رعنائیوں سے سامانِ تسلی پیدا کیا ۔ ایک لحاظ سے یہ یونان کے اشبائی بلوغ کا زمانہ تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تعلیم یافتہ طبقوں کے تمام افراد تھامس تاڑوی ، جارج میریڈتھ ، جارجز کلیمن شو اور اناطول فرانس کی پختہ کاری میں شریک تھے ۔ ۔ ۔ ۔ قوم اس ضبط سے محروم ہو چکی تھی جو استحکام اور قوت کے لیے ضروری ہے ۔ اس طرح یونانی تہذیب کی جو آخری تصویر ابھرتی ہے وہ لعینہ

ویسی ہی ہے جیسے ہماری اپنی مغربی دنیا کی تصویر - یعنی اخلاق سے بیگانگی ، انفرادی افراتفری ، بد اطواری ، جرائم کی کثرت اور خودکشی"۔

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ابھرتی ہے کہ اقبال کی تلخ نوائی مشرق کے متعلق اتنی ہی شدید نہیں جتنی مغرب کے بارے میں ہے - بیشک وہ مشرق کی خرابیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن دبی زبان سے - بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب وہ مشرق اور مغرب دونوں سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں اور دور کہیں مستقبل میں کسی نئی بہتر دنیا کی جھلک پاتے ہیں :

بگزر از خاور و افسونِ افرنگ مشو
کہ نیرزد بہ جوے ایں ہمہ دیرینہ و نو

"پس چہ باید کرد" اور "مسافر" میں اقبال کا رجحان قطعی ہے - وہ اس صورتحال سے دو چار ہیں جس میں نیرنگیِ حالات کے باعث مغرب غالب اور مشرق زیردست تھا - وہ سنگینیِ حالات سے دو چار تھے اور دفاع کے ساتھ جارحانہ اقدام پر مجبور - دراصل سوال غالب اور مغلوب کا تھا جس میں غالب نشۂ اقتدار میں چور قہرمانیت اور نسلی و تہذیبی تفاخر کا نمائندہ تھا - اقبال نے دیکھا کہ ایک طوفانِ حوادث چاروں طرف برپا ہے - ہر طرف آگ لگ رہی ہے اور اس کے شعلے دور دور ہر چیز کو جلا کر راکھ کر رہے ہیں - ایسے میں کوئی تابکے اس عالمگیر طوفان سے اپنا دامن بچاتا اور پھر ایک ذہین ، دیدہ ور ، حساس شاعر جسے تمام نوعِ انسان کی تاریخ ازبر

تھی - ابتدا ہی سے اس کی فکر خاص سانچوں میں ڈھلنے لگ گئی تھی - ظاہر ہے کہ نیا سلسلۂ حالات ایک طویل دورِ انقلاب کی تمہید تھا - کہیں صدیوں بعد نئے قلبِ ماہیت پیدا کرنے والے اسباب رونما ہو رہے تھے - اقبال کا ذہن بیک وقت کتنے ہی منطقوں میں کام کر رہا تھا - مقامی حالات ، برصغیر کی زندگی میں نت نئی کروٹیں ، دنیائے اسلام کے پے در پے حادثات ، طوفان مغرب کے روز افزوں تھپیڑے ، رقابت ، خودفروشی ، ناشکیبائی ، ہوسناکی ، حکمت میکاولی ، نسلی تکبر ، جوع ارض ، استعمار ، ایک طوفان نہ تھمنے والا - مغرب کے تازہ بتازہ نو بنو ترقی یافتہ اور مسلسل ارتقا پذیر علوم و فنون اور افکار و نظریات نیز مغربی تہذیب و تمدن کی بے پناہ یلغار نے مشرق کے نظام کہن کو پارہ پارہ کر دیا تھا - نئی اور پرانی روایات اور انقلاب ، قدامت اور جدیدیت آپس میں دست و گریباں تھے - جوں جوں اقبال کے ذہن میں بالیدگی پیدا ہوتی گئی اور وہ حقائق سے بیش از پیش آشنا ہوتے گئے ، ان کی دنیائے فکر گوناگوں افکار و خیالات کی جولانگاہ بنتی گئی - گویا ایک طاقتور مقناطیس ہے جو لوہ چنی کے جو پارے بھی راہ میں آئیں ان کو مناسب خطوط میں ترتیب دیتا جائے - ان کا ذہن محشرستان خیال ہے - تصورات کا بھرپور ذخیرہ - کوئی انگیخت ہوئی - کوئی واقعہ یا ماجرا پیش آیا مثلاً مسجد قرطبہ ، مزار سنائی ، صفلیہ ، مراد کی بوئی ہوئی کھجور ، تو ان کے تخیلات کے سیمابی اجزا جیسے کسی کیمیاوی عمل کے تحت اس کے گرد جمع ہو کر مربوط شکل اختیار کر لیتے - ''پس چہ باید کرد'' میں حالات و واقعات نے جستہ جستہ ہونے کی بجائے ایک ہی

پیشکش کی شکل اختیار کر لی ہے ۔

مارکسی انقلاب نے اس عام افراتفری کی فضا میں ایک اور پرآشوب عنصر بڑھا دیا تھا ۔ مشرق کا کونسا گوشہ تھا جہاں اس سے تہلکہ برپا نہ ہوا ہو ۔ اس کا کونسا فرزند تھا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس صورتحال سے متاثر نہ ہوا ہو ۔ اس میں تصادم بھی تھا اور اختلاط بھی ، ردِ عمل بھی اور قبولِ اثر بھی ۔ اقبال اور ان کے ہم مذہبوں کے لیے یہ دہری افتاد تھی ۔ ایک طرف دنیائے مشرق کی عبرتناک حالت اور دوسری طرف دنیائے اسلام کی تباہی و بربادی ۔ اس پر برِصغیر کا حشر مستزاد تھا جس نے اس کی حالت ناگفتہ بہ کر دی تھی ۔ اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم تو ایک طرف رہا ، خود اہلِ وطن کی باہمی رقابت اور پرخاش و عناد نے ملک کو قعرِ دوزخ بنا دیا تھا ۔ ایسی بلندی ایسی پستی ! مسلمانان ہند تاج و تخت سے محروم ہو کر اب ایک بے سروساماں محکوم اقلیت بن کر رہ گئے تھے جسے ہندوؤں کی شکل میں ایک سنگدل اور انتقام پسند حریف کا سامنا تھا جس کی پشت پناہی حکومت کر رہی تھی ۔

تہذیبی حیثیت سے افرنگ کی ذہنی و روحانی تاخت و تاراج ملکی فتح و تسخیر سے کہیں زیادہ مہیب تھی ۔ کیونکہ اس کا تعلق خارج کے بجائے باطن سے تھا ۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مشرقی قومیں گو بظاہر مشرقی تھیں لیکن ان کے دل و دماغ مغربی ہوتے جا رہے تھے ۔ مشرق کے مکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا تھا ۔ وہ مغرب کی ہر بات ، ہر ادا پر فریفتہ تھے ۔ یہاں تک ایشیا کی ہر ایک چیز پر پڑی دھتکار ۔ کہیں مکمل مغرب زدگی اور کہیں اس کے بین بین ۔ بقول

اکبر :

نئی نئی لگ رہی ہیں آنچیں یہ قومِ بیکس پگھل رہی ہے
نہ مغربی ہے نہ مشرقی ہے عجیب سانچوں میں ڈھل رہی ہے

مغرب کے ذہنی انقلاب کے اثرات مشرق میں بھی تیزی سے نفوذ کر رہے تھے - یورپ نے بہ صد کرب اپنی کینچلی بدلی تھی - وہ قرونِ وسطیٰ کی قید و بند کی فضا سے نکل کر آزادی کی فراخ دنیا میں قدم رکھ چکا تھا - یہ آزادی مذہبی ، فکری ، سائنسی ، فلسفیانہ ، نفسیاتی اور سیاسی سبھی کچھ تھی - طوفانِ مغرب کے مشرق میں پہنچتے ہی اس کے تہلکہ آفریں اثرات مرتب ہونے شروع ہوئے اور الٹ پھیر کا سلسلہ شروع ہو گیا -

قرونِ وسطیٰ تمام تر مذہب و اعتقاد کا دور تھا جس میں بقول آزاد مذہب کا چوکیدار ہر شعبے پر پہرہ دے رہا تھا - عرفان و ایقان کے عہد میں فقراء و عرفا ، اولیا و اتقیا ہی کا دور دورہ تھا - جبھی اس عہد کی داستانیں ہوں یا منظومات ، درویشوں ، سنیاسیوں ، بھگتوں ، مہاتماؤں ، مہا پرشوں ہی کے گرد گھومتی ہیں - اس میں حاضر کی بجائے غائب اور واقعیت کی بجائے طلسمات پر زور تھا - فکر و عمل کا پیمانہ روحانی اقدار تھیں - اس کے برعکس تہذیبِ مغرب کا مدار غائب کی بجائے حاضر پر تھا - حسی و عینی مشاہدات ، تجربہ ، سائنس ، فلسفہ و حکمت ، معاشیات سب کے سب مادیت اور عقلیت ہی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے - ان حالات میں شرق و غرب کا اجتماع بر اعتبار سے اجتماع ضدین تھا اور جب دو ضدیں آپس میں ٹکرا

جائیں تو اس کا نتیجہ کشمکش کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے — کشمکش جس کا نتیجہ تخریب ہے اور اس کا لازمہ انتشار - مگر ان کے ساتھ اختلاط اور تعمیر کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے - بنائے کہنہ ویران ہو کر نئی تعمیرات کو جنم دیتی ہے -

اقوامِ مغرب کی آمد وسیع پیمانے پر پخت و پز اور از سرِ نو تشکیل کا پیش خیمہ تھی - تہذیب عموماً گولے بارود کی گاڑیوں کے ساتھ ہی نقل و حرکت کرتی ہے کیونکہ اس سے نئی نئی قوتیں اپنی اپنی جداگانہ تہذیبوں ، تمدنوں اور افکار و نظریات کے ساتھ ایک دوسرے سے دوچار ہوتی ہیں اور باہمی داد و ستد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے - یونان نے اپنے زمانۂ عروج میں کیا کچھ اثر نہیں ڈالا - یونانی علوم و فنون ، طب و فلسفہ اور شہرۂ آفاق فلسفی سقراط ، ارسطو اور افلاطون آج تک اس کے شاہد ہیں - روما کا مایہ امتیاز قانون و ریاست تھے اور ان کا وسیع پیمانے پر اثر ہوا - اسلام کے فروغ نے حیات اور فکر و نظر کی ایک نئی دنیا آشکار کر دی جس نے تمام عالم میں ہلچل پیدا کر دی ہے -

تہذیب و تمدن میں وسیع سے وسیع تر کی طرف ارتقائی رجحان ایک بین حقیقت ہے جیسے مرور وقت کے ساتھ درجہ بدرجہ ہر جہتی توسیع و ترقی رونما ہو رہی ہو - لہذا اسلام کے بعد رونما ہونے والی تہذیب کی سابقہ تہذیب پر پیشقدمی لازم تھی - یہ نہیں کہ اقوامِ مغرب میں نسلی یا ذہنی حیثیت سے ترقی کا مادہ نسبتہً زیادہ ہے - ٹائن بی کی عالمانہ تحقیقات نے ان کی برتری کے نظریے کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے - اصل یہ ہے کہ جب کسی قوم کو وسیع تر لوازمات میسر

ہو جاتے ہیں تو اسے ہر گونہ ترقی کے لیے میدان ہاتھ آ جاتا ہے۔ وہ اس خدا داد موقع سے اپنی طبعی صلاحیتوں کے مطابق فائدہ اٹھاتی ہے اور دوسری کم استطاعت قوتوں سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ پھر عجب نہیں کہ جب تہذیبِ مغرب اپنے انجام کو پہنچ جائے تو دوسری قومیں اس کی دریافتوں اور پیش قدمیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ وسیع و ترقی یافتہ تمدن پیدا کریں اور مشرق پھر مغرب کو پسِ پشت ڈال دے۔ تاریخ میں ایسا رد و بدل ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا کہ انقلاب کو بھی انقلاب ہی دیکھا۔

غرض جب اقبال نے اپنے گرد و پیش نظر ڈالی تو انھیں یہ کیفیت نظر آئی۔ مشرقی قومیں اپنے محور سے ہٹ رہی تھیں۔ جدید مادی علوم دل و دماغ کو مسحور کر رہے تھے۔ ان کے سامنے عرفان و ایمان کے چراغ تابکے جلتے رہتے۔ ان کے جوہر بظاہر زائل ہو چکے تھے۔ کیونکہ اب سے کشمکشِ حیات میں درپیش تقاضوں میں کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ محکومین کو طوعاً و کرہاً انگریزی اور اس کے ساتھ جدید علوم و فنون کی تحصیل کرنی پڑی۔ پھر حکمراں قوم سے رابطہ و اتحاد کی ضرورت بھی پیش آئی۔ معاشرت، سیاست اور معیشت کے نئے نئے طور و طریق کو بھی اپنانا پڑا۔ اس طرح مغربی نظام کے نمایاں خصائص۔ بقول اکبر مغربی ریزے۔ حیات مشرق کے ہر ہر شعبے میں سرایت کرنے لگے۔ نئی نئی تحریکیں جاری ہونے لگیں اور موجودہ دنیا کا سارا کارخانہ حرکت میں آ گیا جس سے ہم آج کل مانوس ہو چکے ہیں اور اسی کو تہذیب کا حاصل سمجھتے ہیں۔

اقبال نے دیکھا کہ اسلام کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی - جو کچھ مغرب میں ہاپائیت کے ساتھ ہوا تھا وہی یہاں خلافت سے ہوا - ترکوں کو نادان کہو یا دانا ، انھوں نے خلافت کی قبا چاک کر دی بلکہ انھیں اپنی سلامتی کے لیے مجبوراً ایسا کرنا پڑا - تشتت و افتراق کے دروازے کھل گئے - مغربی اقوام کی قوم پرستی کو دیکھتے ہوئے ہر کوئی جداگانہ قومیت اور اوطان کی گردان کرنے لگا - یہاں تک کہ وہ علماء بھی جو شرع کے حقیر سے حقیر مسئلوں پر مرنے مارنے پر تلے رہتے اور کفر کے فتوے عائد کرتے نہیں تھکتے تھے ، برملا عہدِ حاضر میں اوطان ہی کو ملتوں کی بنیاد قرار دینے لگے - نتیجتہً ملتِ اسلامیہ لخت لخت ہوگئی - اس کا کوئی مرکز نہ رہا - اس کی جمعیت کا شیرازہ پریشاں ہوگیا بلکہ اس کا وجود ہی برائے نام تھا - اور جب امت ہی نہ رہی اور ہر کوئی اپنا راگ الاپنے لگا تو پھر اس ''مرکزِ محسوس'' (کعبہ) کی طرف کون رجوع ہوتا جسے اقبال نے وجودِ ملی کے لیے لازمی قرار دیا ہے ؟ عجمی ، ہندی ، ترک سب ایک دوسرے سے بیگانہ بلکہ بعض صورتوں میں دست و گریباں ہو گئے -

سب سے بڑی ضرورت جس کو محسوس کرنا لازم تھا وہ ذاتی اور قومی وجود تھا - اگر یہی نہیں تو ساری تگ و دو اور جد و جہد بے معنی ہے - ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنے ہی لیے کرتے ہیں - یہ بڑی سامنے کی بات ہے اور اسے ۱۸۵۷ء کے فوراً ہی بعد محسوس کر لیا گیا - اگرچہ اسے کوئی نام نہیں دیا گیا تھا - اقبال نے اسے ''خودی'' کا نام دیا - اس کا محض احساس ہی کافی ہے - اقبال نے

اسے فلسفہ کے زور سے تقویت پہنچائی ۔

اپنے دور کے یہ تمام پہلو اقبال کے پیشِ نظر تھے۔ اقوامِ مشرق کی حالتِ زار کی جھلکیاں ان کے کلام میں جابجا دکھائی دیتی ہیں جن پر جستہ جستہ نظر ڈالنے سے ان کی مجموعی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے :

ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت
از دمِ او سوزِ الاالله رفت
مصریاں افتادہ در گردابِ نیل
سست رگ تورانیانِ زندہ پیل
آلِ عثماں در شکنجِ روزگار
مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
عشق را آئینِ سلطانی نماند
خاکِ ایراں ماند و ایرانی نماند
مسلمِ بندی شکم را بندۂ
خود فروشے ، دل ز دیں برکندۂ

فرنگ آفریند ہنرہا شگرف
برانگیزد از قطرۂ بحرِ ژرف
کشد گرد اندیشہ پرکارِ مرگ
ہمہ حکمتِ او پرستارِ مرگ

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

تھا جو 'ناخوب' بتدریج وہی 'خوب' ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر !
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام
اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم !

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست !
صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار
شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر !
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے !
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز !
تفریق امم حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم !
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد

چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد !
قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد !

زندہ کر سکتی ہے میرانِ عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور !

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام !
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام !
تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت !

یہ سب بڑی پتے کی باتیں ہیں لیکن پورا نقشہ اسی صورت میں اجاگر ہو سکتا ہے جب ان کو جامع پیرائے میں پیش کیا جائے۔ بکھرے بکھرے ریزوں سے مجموعی ہیئت پوری طرح ظاہر نہیں ہوتی اور نہ ہم اس کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ خود اقبال کو بھی یہ احساس تھا۔ وہ متفرق اشعار میں خودی (ذاتی و ملی)، حق، حیات، ارتقا وغیرہ کو موضوعِ سخن ٹھہرا کر پیغام رسانی کا منصب کماحقہٗ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لیے ایک مستقل پیشکش کی ضرورت تھی۔ متعدد الواح کی بجائے ایک ہی جامع لوح کو شمع راہ بنایا جائے اور تمام پہلوؤں کو اجاگر کر کے ایسا نقشہ پیش کیا جائے

جسے بیک نگاہ دیکھا جا سکے ۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب اقوام مشرق سے براہِ راست خطاب ہوا ، تمام متعلقہ امور کا احاطہ کیا جائے ، موجودہ حالات میں نجات کی راہ سجھائی جائے ، عوارض کی تشخیص ہو اور ان کا علاج تجویز کیا جائے ۔ حالات کی نوعیت اسی کی متقاضی تھی ۔

یہ احساس اجزائے فکر کی شیرازہ بندی کرتا رہا اور اس نے رفتہ رفتہ شدید سے شدید تر ہو کر محسوس و مرئی شکل اختیار کی ۔ مشرق کے حالاتِ حاضرہ کا بھرپور مرقع ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق'' ۔ یہ وہ تصنیف ہے جو بقامت کہتر ہوتے ہوئے بہ قیمت گراں تر ہے ۔ اقبال نے حالاتِ حاضرہ کو دیکھتے ہوئے بارہا اس سوال پر غور کیا ہوگا ۔ انھوں نے دیگر فرزندانِ مشرق کی طرح لیکن ان سے کہیں زیادہ بصیرت اور شدت کے ساتھ مشرق کی دگرگوں حالت کا مشاہدہ کیا ہوگا اور خود سے پوچھا ہوگا کہ ان نازک ، پُر آشوب حالات میں صحیح اقدام کیا ہے ۔ ''پس چہ باید'' اس سوال کا جواب ہے ۔ جس میں بوقلمی سرسری طور پر کوئی تجویز پیش نہیں کر دی گئی بلکہ نوع انسان کے تمام تجربے اور موجودہ کوائف کو پیشِ نظر رکھ کر مداوا تجویز کیا گیا ہے ۔

فکرِ اقبال کی یہ کیفیت چیلنج اور جواب کے اصول کے مطابق سلسلۂ حالات سے خود ابھری ہے ۔ اس کی حیثیت نامیاتی ہے ۔ گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر فلسفہ آرائی اور نکتہ آفرینی کا نتیجہ نہیں ۔ جیسے یہ محض خلا کی پیداوار ہو ۔ ہند قدیم کے فلسفے کی طرح یہ کوئی خیالی فلسفہ نہ تھا بلکہ تمام تر حالات ہی کا پروردہ اور ان ہی کی

روشنی میں قابلِ فہم ہے - یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کے کئی سابقہ ادوار کی طرح مشرق اور مغرب کا انتہائی سنگین طور پر سامنا تھا اور طرفین میں جو حالت جماعت کی تھی وہی افراد کی بھی تھی - وہ اپنے ردِ عمل اور رجحان میں شریک تھے - دفاع اور جامعیت کے لوازمات اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ موجود تھے - مشرق کے لیے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ مغرب کے پیرِ تسمہ پا کو کس طرح گلے سے اتار کر دے ٹپکے اور اس کا قلع قمع کر دے - اس کی اپنی طاقت از سرِ نو بحال ہو اور وہ اپنی آزاد ، طبعی زندگی بسر کرنا شروع کر دے - بلکہ ممکن ہو تو الٹا مغرب کو زیرِ نگیں کر لے - قوموں میں خروج ، حرب و ضرب اور فتح و شکست کا یہ سلسلہ تاریخِ انسانی کا لازمی جزو ہے - حالات کی رو حیات کو نت نئے رنگوں سے رنگین اور اس کی ہیئت کو بدلتی جاتی ہے -

یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ ایک مغربی نقاد ایچ ٹی سوریلے نے جو شاہ بھٹائی کو متعارف کرنے میں شہرت رکھتا ہے ، اقبال کو ہدف تنقید بنایا ہے کہ ان کا فکر خالی خولی فلسفہ ہے جو تمام تر گوشۂ خلوت کی پیداوار ہے - شاعر نے اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھ کر فکر اور کلام دونوں کے ہیولے تراشے ہیں - ان میں کوئی تپش ، ہیجان ، کسک یا خلجان نہیں - کاتل لوس یا ابن زیدون کی طرح خطروں میں کود پڑنا یا قرطاسوس ، سوان ، سنبکا یا گھوڑ سوار سورماؤں کی طرح دلیرانہ مہم جوئی تو کیا بائرن اور ہیوگو جیسے رومانوی شاعروں جیسا جیالا پن بھی نہیں - اگر ان میں ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی امنگ بھی ہوتی تو وہ بہتر شاعر ثابت ہوتے (شاید نقاد

کے ذہن میں ہالہ پر ستائشی نظم تھی جس کا موازنہ بائرن کی ''چائیلڈ ہیرلڈ'' میر مونٹ بلانک کی شدید مشاہداتی وضع سے کیا جا سکتا ہے گویا ہم عین اس موقع پر موجود ہیں) - لیکن انھیں سنسنی یا منچلے پن سے ذرا بھی مس نہ تھا -

اقبال سنگھ نے ''مجموعہ' اضداد ہے اقبال نہیں ہے'' کو نوبیگلی قسم کی ذاتی سیرت شناسی قرار دیتے ہوئے اپنے مضمون ''اقبال : اے پیراڈاکس'' میں سورلے کی اس تنقید کو ایک سطحی ناظر کی ناتواں بینی یا ہرزہ سرائی قرار دیا ہے - لیکن ساتھ ہی تسلیم کیا ہے کہ اقبال کی زندگی بے حد روکھی پھیکی قسم کی زندگی تھی جس سے کوئی بڑا ہی سپاٹ نقشہ مرتب ہوتا ہے - ان میں وہ آتش منشی نہیں جو انسان کو تلاش حق کی خاطر دنیا کے گوشے گوشے میں دوڑاتی ہے - یہ صورت حال یا تو مواقع میسر نہ آنے یا طبعی جمود کا نتیجہ ہے - قریب قریب وہی بات جو سورلے نے کہی ہے لیکن زیادہ سنجیدہ پیرائے میں -

درحقیقت ایسے شاعروں کی عملی حس خارج کی بجائے باطن یعنی حرارت دروں میں ظاہر ہوتی ہے - اندر کی قیامت باہر کے ہنگاموں کو پس پشت ڈال دیتی ہے - ملٹن ، ورڈزورتھ ، کیٹس یا ٹیگور میں ایسی کون سی ہنگامہ آرائی دکھائی دیتی ہے ؟ عطار ، رومی اور حافظ میں بھی ایک روحانی لگن تھی جس نے ان کو والہیت اور شوریدگی عطا کی - یہی حقیقی احساس دروں شاہ بھٹائی کے شخص و فکر کی روح رواں بھی ہے - دریں حالات اقبال کے ذاتی سوانح اور کوائف کو محل توجہ بتانے کی بجائے بہتر ہوگا کہ ہم ان کے کلام

اور افکار پر توجہ مرکوز کریں جو بلیغی طور پر حالات کی پیداوار اور گوناگوں واقعات سے لے کر مجموعی حالات کا ترکی بہ ترکی جواب ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کا ایک اطالوی نقاد یہ نہ پکار اٹھتا کہ ''اسرار خودی'' مشرق کے مغرب پر حملہ' ترکانہ کی تحریک ہے جو خطرناک امکانات سے مملو ہے ۔ دیگر مغربی مبصروں نے بھی اسی قسم کے تاثرات کا اظہار کیا ہے جسے اس سلسلے میں حجتِ قطعی تصور کرنا چاہیے ۔ ہم جیسے جیسے حالات کے ساتھ چلتے جائیں ، اقبال اور کتنے ہی ارباب ملک بعینہٖ ایسے ہی میلانات کی عکاسی کرتے ہوئے دکھائی دیں گے ۔ فکر و عمل کے جو بھی مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں وہ قانون کی اصطلاح میں (RELEVANT CONDUCT) ہیں یعنی جیسا واقعہ ہو ویسا ہی طرزِ عمل ۔ برصغیر کا کوئی بھی فرد یا قوم ہو اس کا طرزِ عمل ایک ہی جیسا ہے ۔ اور ہندو مسلمان اس میں یکساں ہیں ۔ ان کا مطمح نظر جیسے بھی ہو غلامی کا جوا اتار پھینکنے اور آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد ہے ۔ یہ ایک نمایاں حقیقت ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ سر سید ، قائد اعظم ، ابوالکلام آزاد ، شبلی نعمانی ، عنایت اللہ مشرقی ، میاں سر فضلِ حسین اور اقبال نیز علماءِ ندوہ اور احرار اپنے اپنے طور پر آزادیٔ وطن ہی کے حامی رہے ۔ سب کے سامنے ایک ہی راہ اور ایک ہی منزل تھی ۔ وہ سب ایک ہی ناؤ کے سوار تھے ۔ مغرب کی مخالفت اور اس کے خلاف جد و جہد ان کا مشترکہ محاذ تھا ۔ سوال برِ صغیر یعنی مشرق بخلاف مغرب کا تھا ۔ ہندو مسلم جنگِ آزادی میں ایک ساتھ رہے ۔ اگر ایک طرف جھانسی کی رانی اور نانا صاحب تھے تو دوسری طرف شہزادہ فیروز بخت اور مولوی احمد اللہ شریک

تھے - یہ اشتراک ذہنی طور پر جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد بھی برقرار رہا - یعنی دونوں قومیں آزادی کی جد و جہد میں کم از کم وقتی طور پر ایک دوسرے کی ہم مشرب رہیں - خصوصاً اس لیے کہ کانگرس نے نہ بھی کھلے بندوں اپنی فرقہ پرستی کا اظہار نہیں کیا تھا - روایتاً بھی ماضی میں ہندو مسلم رہن سہن میں سنجوگ کا ثبوت ادب میں ملتا ہے - مثلاً ہوتھی ادب یا ہیر رانجھا، راجہ رسالو اور پورن بھگت جیسی ہر دلعزیز اور کھلی ملی زندگی کی عکاسی کرتی ہوئی کہانیاں - گزشتہ صدی کی ساتویں آٹھویں دہائیوں کے چند روزہ عبوری دور میں شعور برابر اسی پرانی رو ہی میں بہتا رہا کیونکہ اپنائے وطن کے تیور اچھی طرح واضح نہیں ہوئے تھے - اوائل عمر میں اقبال کا ذہنی بہاؤ بھی اسی کے ساتھ ساتھ رہا - یہ محض اتفاق نہیں کہ ان کی ابتدائی تحریروں میں جا بجا ایک رچی ہوئی ملنساری کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں - ''ہمالہ'' ہر پہلی ہی نظم میں گوتم بدھ کا ذکر تھا جسے بعد میں قلمزد کر دیا گیا اور 'مسکن آبائے انسان جب بنا دامن ترا' کے ساتھ بندگانِ حق نما کا اشارہ، محض بندی بھگتوں کی طرف ہے - اوتاروں کا ذکر ہم کر ہی چکے ہیں - سوامی رام تیرتھ، گورونانک اور رام پر نظمیں اور 'گایتری' نسی سیاسی مسلک کی رہینِ منت نہیں بلکہ سماجی رکھ رکھاؤ اور بیوہار کی علامت ہیں - وہی جس کی بھرپور جھلک ہیر کی دستان میں رانجھا کے جوگی بن جانے میں دکھائی دیتی ہے - ہندی سے لگاؤ اور ہندی الفاظ کی دھپت بھی کسی سطحی یا نمائشی شوق کا نتیجہ نہیں بلکہ تہذیبی خلا ملا کی علامت ہے جس میں بظاہر حب الوطنی کی تحریک کو دخل نہیں -

بعد میں جوں جوں حالات بدلتے گئے او ہندو جاتی خالص ہندو جاتی بن کر اپنا الگ پنڈال جمانے اور راج پاٹ سنبھالنے پر اتر آئی تو گوناگوں سیاسی الجھنیں خود بخود پیدا ہو گئیں اور ان کے نتیجے میں کشیدگی پیدا ہوئی جو مسلمانوں کو وطنیت سے ہٹا کر ملت کی طرف لے گئی جس میں اقبال ہی نہیں اکثر دیدہورانِ قوم بھی شامل تھے۔ ایک طرف ملکی اور دوسری طرف بین الاقوامی حالات نے ان مخصوص ملی و بین الملی افکار کو جنم دیا جو ان کے فکر و فن کا مستقل موضوع بن گئے۔ لہذا ان کی اہمیت کو جانچنے کا پیمانہ فرضی خیال آرائی نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کے تقاضوں کے ساتھ کس قدر یکساں ہیں۔ خواہ یہ تقاضے موجودہ ہوں یا آیندہ۔ اگر اقبال کا فلسفۂ حیات اور مشرق و مغرب پر نقد و نظر کسی مستقل بنیادی اہمیت کے حامل ہیں تو انھیں بمشکل فلسفیانہ موشگافی کی پیداوار قرار دیا جا سکتا ہے۔ کچھ وجدان اور کچھ فیضِ تربیت کے باعث اقبال میں انسانیت کی تیز حس پیدا ہو چکی تھی۔ اسلام خود سراپا انسانیت ہونے کا دعویدار ہے۔ خواہ ہم اسے ایمان قرار دیں یا وطنی، ملی، بین الاقوامی فضا کے مطابق ڈھال، نوعی اعتبار سے ان کے ابتدائی اور آخری مظاہر میں کوئی فرق نہیں۔ دشواری صرف یہ ہے کہ قاری کا ذہن اسلام اور انسانیت کو مترادف سمجھنے سے گریز کرتا ہے اور اسلام کو مذہب ہی شمار کرتا ہے۔ قبل کے یہاں اس کے وسیع اور شرعی دونوں پہلو ملتے ہیں۔ جہاں تک اصولیت کا تعلق ہے، ان میں وسیع آفاقی پہلو ہی غالب ہے۔ ان کی دیگر تصنیفات کی طرح "پس چہ باید" بھی انھی افکار کی آئینہ دار ہے جن کی وہ عموماً ترجمانی کرتے ہیں۔

صرف موضوع کی مناسبت سے ان کی ترتیب میں فرق ہے۔

اس اشتراک فکر کی جھلک ہمیں اس کے اولیں نقش ہی میں دکھائی دیتی ہے جس میں ''عشق'' پر زور ہے۔ وہ سودائے خوش جو 'طبیب جملہ علت ہا' کے نام سے موسوم ہے اور جس میں مسٹر سورلے کو مسیحیت کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اس کی مسحور کن کشش کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکے، جیسا کہ انہوں نے نظم ''ہمت'' کے سلسلے میں کہا ہے اور اسے اقبال کے اعلیٰ ترین فن پاروں میں شمار کرتے ہوئے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ (مشمولہ ''وانڈرنگ میوز'')۔

'عشق' اقبال کی فکر کا مرکزی نکتہ ہے جس کا انہوں نے بار بار انتہائی شد و مد اور والہانہ ذوق و شوق سے ذکر کیا ہے کیونکہ یہ خود حیات ہی کا جوہر اور فعال عنصر ہے جسے وہ مختلف ناموں سے یاد کرتے نہیں تھکتے - سوز دروں، سوز درون کائنات، میر کارواں، امام (عشق است امام من) تمام اسمائے عشق ہیں جن کا وہ برابر ورد کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم زیادہ باریکیوں میں نہ جائیں تو عشق کا مفہوم بخوبی ظاہر ہے۔ زندگی کی حرارت، ذوق عمل، جذبہ و جوش، جرأت، رندانہ، قوت جذب و ہضم، جذبۂ تسخیر، فعالیت، امنگ، خود افزائی، خود افروزی، اقدام، میلان، ارتقا، غرض وہ تمام امور جن کا حرکی معنوں میں تصور کیا جا سکتا ہے اور جو جمود کی نفی کرتے ہیں۔ خود حیات کی نمود وہ اس ازلی تحریک سے ہوئی جو سکون کو پیغام اجل ہے:

بر آمد شوق از خلوت نہــاد ایں راز بر صحرا

توجیہ. کائنات ایک عقدۂ دشوار ہے اور اس کا واحد حل کسی ابتدائی اقدام ہی میں نظر آتا ہے جس سے تغیر کا آغاز ہوا ۔ ورنہ آفاق کو ابدأ جامد اور الآن کما ہی تسلیم کرنا پڑے گا ۔

از خامۂ نقاش بروں نامدہ ہرگز
ہر نقش کہ بینی ز پس پردہ ہویــدا

یہاں عشق کے ماورائی مفہوم کو زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں جو کائنات کا محرک اور نفس ناطقہ ہے اور جس کا رومی و اقبال اس لیے ذکر کرتے ہیں کہ ان کو بھی مشیت ازلی اور کائنات سے ہم آہنگی کے لیے اس کا اختیار کرنا لازم ہے ۔ ایسے ہی سر دست سلوک و عرفان سے بھی صرف نظر مناسب ہے کیونکہ اقبال کا مسئلہ اقوام مشرق کی از سر نو سرگرمیٔ حیات ، توانائی ، گرم رفتاری اور ہنگامہ آرائی تھا ۔ وہ اس کی افسردہ رگوں میں خون حیات دوڑا دینا چاہتے تھے تا کہ وہ حقیقی معنوں میں زندہ و توانا اور کشمکش حیات کے قابل ہو جائیں ، ان کا موجودہ جمود دور ہو جائے اور وہ حیات کی جد و جہد میں پوری سرگرمی سے حصہ لے سکیں ۔ پھر مقابلہ مغرب کی ترقی یافتہ مادی تہذیب سے تھا ۔ اس لیے اولیں ضرورت ترک جمود اور اقدام کی طرف رجوع تھا ۔ ہاں تاریخ ، خصوصاً اسلامی نہضت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے انقلاب اندر شعور (ان اللہ لا یغیرو ما بقوم حتیٰ یغیروا ما با نفسھم) پر زور دیا جس سے مراد وہ باطنی اور لازماً روحانی قوتیں ہیں جن کے حدود قدرتی طور پر ایمان و عرفان

اور طریقت و شریعت سے جا ملتے ہیں ۔ اقبال کے تصورات سے بخوبی عیاں ہے کہ وہ کائنات کی مادی تسخیر ہی نہیں روحانی تسخیر کے بھی قائل ہیں جو مادی تسخیر پر فوقیت رکھتی ہے ۔ عبد اور عبدہ' کا فرق ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ عبدہ' کی کائنات پر فرماں روائی ہے ۔

مگر با ایزد انباز است آدم / مردِ حق آخر سراپا حق شود

اسی طرح انھوں نے کہا ہے کہ :

عبدہ' چند و چگونِ کائنات عبدہ' راز درونِ کائنات

یہاں خیال کا سلسلہ صریحاً سنّری ہو جاتا ہے اور جمہور اس سفرِ شوق میں ان کا کم ہی ساتھ دے سکتے ہیں ۔ ہاں اس سے کم سطح پر عمومی انقلاب ان کی دسترس میں ہے ۔ اقبال کا مقصود گو حقیقتاً بہت بنیادی قسم کا انقلاب برپا کرنا ہو مگر عملاً وقتی طور پر ان کا مطمح نظر فقط طبیعی انقلاب یا احیائے ملیہ تھا ۔ ،

لہذا عشق کی آسمانی بلندیوں کو چھوڑ کر ہم خاکدان سفلی کی طرف آتے ہیں جہاں اقبال کا جذبہ و جوش ایک فعال عنصر کے طور پر کارفرما ہو سکتا ہے اور جس میں مذہبی ولولہ اور حرارت ایمانی کی گنجائش اسی ہے اور شدت بھی ۔ کیونکہ مذہب کی روایتی ، دل و جگر کی گہرائیوں میں جاگزیں اہیل قوائے عمل کو انتہائی شدت سے برانگیختہ کر سکتی ہے اور حصولِ مقاصد میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے ۔ مشرق میں تمام تحریکیں اسی بنیاد پر کامیاب ثابت ہوئی

ہیں اور دورِ جدید میں اسلامی تاریخ ایسی تحریکات کی معرکہ آرائیوں سے پُر ہے - بر صغیر کا جہاد آزادی ، تحریکِ خلافت ، مہدی سوڈانی کی تحریک ، عبدالوہاب کی تحریک ، ان سب کی بنیاد دینی جذبات پر استوار ہے - ان سے قطع نظر خود تحریکِ پاکستان کی کامیابی مذہبی جوش و خروش ہی کی مرہونِ منت ہے - مختصر یہ کہ عملی طور پر عشق کو ایمان کی حرارت اور گرم جوشی ہی سے تعبیر کرنا چاہیے جس کا مقصد حیات کو فعال بنا کر دنیائے انسان میں انقلاب پیدا کرنا ہے - بالفعل اقوام مشرق میں جو محکومی و زیردستی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ، یہی ہنگامۂ باطن پیدا کرنے کی ضرورت ہے - نظم کی ابتدا ہی میں اس کلیدی یا آپ سو زور ساری نظم کا آہنگ اور لب و لہجہ متعین کر دیتا ہے اور ہم ایک نشید انقلاب سننے کے لیے گوش بر آواز ہو جاتے ہیں -

عشق کے ساتھ ہی اقبال نے دوسری اہم بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے : کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است - یہ ایک بلیغ فقرہ ہے - اربابِ نظر جانتے ہیں کہ فلسفۂ اسلامی کی تاریخ میں جب یونانی افکار و خیالات کو فروغ حاصل ہوا تو ایسی ہی تعقل پرستی کی تحریک ظہور میں آئی تھی اور الٰہیاتی فلسفہ معرض خطر میں پڑ گیا تھا - مغرب کے جدید علوم و فنون اور نظریات نے بھی ایسی ہی تشکیک اور تعقل پرستی کی فضا پیدا کر دی ہے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے - نشاۃ اولیٰ یہ عہد سرسید کے دوران میں جو نیچریت اور عقلیت کا زور ہوا وہ محتاجِ بیان نہیں - سائنس اور فلسفہ کے زیرِ اثر بغاوتِ خرد ، تشکیک ، دہریت اور مادیت کے

غلے نے وہی کیفیت پیدا کر دی کہ ''میں آیا ، میں نے دیکھا ، میں نے سر کیا'' ۔ مشائخ نے جو ہمیشہ بر سرِ اقتدار قوتوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے ہیں ، مذہبی تعلیمات میں بے دریغ تصرف کرنا شروع کیا ۔ اور اپنی ہی کلہاڑی سے دین کی جڑیں کاٹنی شروع کر دیں ۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس کے اجزا ہمیں اس دور کی پوری تاریخ میں ، یہاں تک کہ آج بھی بکھرے ہوئے ملیں گے اور ان سب میں نام نہاد علمائے دین کا کردار بہت نمایاں دکھائی دے گا ۔

تو یہ تھی بغاوتِ خرد ۔ یہ وہ بغاوت تھی جو ۱۸۵۷ء کے عظیم سانحۂ ملی سے بھی زیادہ خطرناک تھی ۔ کیونکہ اس نے تو صرف برِ صغیر میں اسلامی حکومت کا خاتمہ کیا تھا لیکن یہ بغاوت خود دین کی جڑیں ہی اکھیڑ دینے کے درپے تھی ۔ اگر یہ بغاوت کامیاب ہو جائے—اور اب تو سائنس اور فلسفہ کے ساتھ نفسیات ، لادینی (سیکولر) نظریے ، اشتراکیت ، جنسیات ، اقتصادیات ، عمرانیات ، فلکیات ، ٹکنالوجی ، جدید ذرائع ابلاغ اور تہذیبِ مغرب کا مادی طلسم بھی جس میں تحریکِ عریانی ایک مجرب عنصر ہے ، شریک ہو گئے ہیں—تو ظاہر ہے مشرق تمام تر مغرب کا نمونہ بن جائے گا اور اس کا اپنا مخصوص وجود (خودی) برقرار نہیں رہے گا اور مغرب کا یہ خواب کہ مشرق اس کا تابع مہمل بن جائے ، شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا ۔

کیا اقوامِ مشرق اس کے لیے تیار ہیں ؟ کیا وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اپنا دل و دماغ بیچ کر اپنی آزادی کا سودا کر لیں ؟ کیا وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ امریکہ اور روس کی مہا طاقتیں دنیا کو اپنے

اپنے منطقوں میں بانٹ کر کوس لمن الملک بجائیں ؟ اگر وہ یہ صورتِ حال قبول کر لیں تو یہ ذہنی اور نسلی حیثیت سے ان کی تباہی کا باعث ہوگی کیونکہ زندگی ذوقِ تحقیق ، ذوقِ تجدید اور ارتقائے مسلسل پر موقوف ہے - اگر ہم ذہن اور ضمیر کی پنہاں قوتوں سے ، جن کا کوئی اندازہ نہیں ، کام لینا چھوڑ دیں اور نقالی پر ہی اکتفا کریں - قرآن میں کونوا قردۃً خاسئین کا بالتصریح ذکر ہے -- تو ہم خود اپنی موت کو دعوت دیں گے - زندگی ایج ہی ایج ہے ، لکیر کا فقیر ہونا نہیں -

اقبال اقوامِ مشرق کے اس حشر کے لیے تیار نہ تھے - انھوں نے تقلید مغرب کے مضمرات اچھی طرح سمجھ لیے تھے - وہ جانتے تھے کہ قوموں کی حقیقی نشو و نما آزادی ہی کی فضا میں ممکن ہے جس میں وہ اپنی طبعی صلاحیتوں کے مطابق اپنی ایج سے سرگرم کار ہوں - اسی لیے حملۂ مغرب کے جواب میں انھوں نے فلسفۂ خودی کا ادراک کیا - یعنی اس کے مقابلے میں اپنے وجود کو کھڑا کیا جائے - قدرتی طور پر جب بھی کسی فرد یا جماعت پر کوئی بیرونی عنصر حملہ آور ہوتا ہے تو اس کی قوتِ مدافعت بروے کار آتی ہے - اس کی انا خود بخود ابھر آتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے گرد حصار کھینچے اور خود کو مضبوط سے مضبوط تر کرے تاکہ جارح عنصر اس کی حدود ولایت میں سرایت نہ کر سکے - خواہ ہم اقبال کی فلسفۂ خودی تک رسائی کو ذاتی ایج اور فلسفۂ مغرب یا اسلامی ادبیات کے مطالعہ کا نتیجہ قرار دیں ، بہرحال اتنا ظاہر ہے کہ حالات خود اس کے محرک تھے - جیسا کہ غیر مسلم

قوام کے سلسلے میں بھی ہوا ۔ قبل ازیں جب اسلامی فتوحات نے مغرب میں تہلکہ برپا کر دیا تھا تو وہاں بھی بعینہٖ ایسے ہی رجحانات رونما ہوئے تھے اور اسلام کے سیلِ بے زنہار کو روکنے کے لیے پشتوں پر پشتے باندھے گئے تھے ۔ اقبال کا فلسفۂ خودی اختیار کرنا انھی تاریخی نظائر کی روشنی میں قابلِ فہم ہے ۔

کیا فلسفۂ خودی اقبال کا اپنا نتیجۂ فکر ہے یا اسلامی افکار سے ماخوذ ؟ یہاں اس بحث کو اٹھانے کی ضرورت نہیں مگر جیسا کہ بوزانی نے کہا ہے ۔ یہ بات خالی از تعجب نہیں کہ جدید انداز کے باوجود اقبال کی وضع بنیادی طور پر اسلامی ہی لگتی ہے ۔ یہی بات فلسفۂ خودی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی مآخذ میں اس کے قرائن موجود ہیں ۔ اقبال سنگھ کی اس رائے کے باوجود کہ اقبال کا ذہن و شخص تمتع ز ہر گوشۂ یافتم کا مصداق ہے ، حقیقی صورت حال یہی معلوم ہوتی ہے کہ ابتداءً اقبال کو اسلامی تصور خودی کا شعور نہ تھا ۔ اگرچہ یہ مبہم طور پر ان کے ذہن پر نقش تھا ۔ جب فلسفۂ مغرب کے مطالعہ سے اس کا علم ہوا تو ان کا ذہن اسلامی مآخذ خصوصاً قرآن اور اس کے کلیدی الفاظ ــ نفس اور روح ــ کی طرف رجوع ہوا ۔ اور اس بازگشتی عمل سے اسلامی ادبیات ہی میں فلسفۂ خودی کا سراغ مل گیا ۔ اور غیر کے وسیلے سے اپنی ہی جنسِ گراں مایہ کی بازیافت ہوئی ۔ اگرچہ اس عمل کا ابتدائی ہیولائی وضع پر گہرا اثر پڑا ۔ یہاں تک کہ اسلامی ہوتے ہوئے بھی اس پر مغربیت کا گمان ہونے لگا ۔

خرد کی کار آفرینیاں مسلم لیکن ان میں جو مضرت رسانی کا امکان ہے ، اس کا ازالہ عشق ہی کے جلا بخش تہذیبی عنصر سے ممکن ہے جو ان کو صحیح نہج عطا کر کے حیات انسانی میں ان کا صحیح مصرف پیدا کرتا ہے ۔ لہذا علمی و عقلی تحقیقات اور دانش برہانی کے نتائج خواہ کتنے ہی وسیع ہوں ، انھیں صالح حیات کو ملحوظ رکھے بغیر رو بہ عمل لانا ضرر سے خالی نہیں ۔ علم اور عقل مقصود بالذات نہیں بلکہ محض حیات کو خوب تر بنانے کا ذریعہ ہیں ۔ عقل کے جسم پر جنونِ عشق ہی کی قبا زیب دیتی ہے ۔ جس طرح نسخہ ہائے شفا میں بعض جز مصلح ہوتے ہی اسی طرح عشق بھی عقل کا مصلح ہے ۔ اس سے ہم بالراست اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مجرد عقل فاسد ہے ۔ اس کی پرکھ ، اس کی اصلاح ، اس کو مفید بنانا اُس انسان پر موقوف ہے جو صحیح بصیرت اور اتقاد مزاج رکھتا ہو ۔ یعنی بندۂ مومن جس کا دل نور ایمان سے روشن اور رامت ہیں ہو ۔ وہ عقل کے مادۂ فاسد کا ادراک کر سکے اور اپنی نگاہ نکتہ بیں سے جو خیر کو شر سے ممیز کرتی ہے ، عقل کو رفاہی و تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کرے ۔ عقل کی ادنٰی سے ادنٰی دریافت مثلاً آگ بھی اسی صورت میں مفید ہے کہ اس سے حرارت اور روشنی کا کام لیا جائے نہ کہ آتش زنی اور خانماں سوزی کا وسیلہ بنایا جائے ۔ تیغ و تفنگ تو کیا انسان کشت و خوں کے لیے اپنے دست و پا کو بھی استعمال کر سکتا ہے جیسا کہ برنارڈ شا نے کہا ہے ۔ ان کے صحیح استعمال کے لیے عشق یعنی صالح فکر و احساس لازم ہے ۔ اس طرح بندۂ مومن کی نگاہ پاک بیں ہی خرد کا

احتساب کرتی ہے ۔ اس کا کھوٹا کھرا پرکھ کر اس کی مسِ خام کو کندن بنا دیتی ہے ۔ یعنی مضرت رساں ہونے کی بجائے مفید ۔

اس تمہید کے بعد عطار ، رومی اور اقبال کی مرغوب بحر (رمل مسدس مقصور) میں مثنوی ہے جو تقریباً ۶۰۰ اشعار پر مشتمل ہے ۔ موضوع اس قدر صاف ہے کہ اس کے لیے بیان یا ترتیب میں کسی پیچ و خم کی ضرورت نہیں ۔ اول شاعر کو یہ واضح کرنا ہے کہ اقوام کی زندگی میں کن عوامل کو دخل ہے ۔ اور وہ کونسے اسباب ہیں جو اس کی بقا کے رازدار ہیں ۔ تاکہ ان کی بنا پر دستورِ حیات مرتب کیا جائے ۔ اگر حصارِ ملت ان کی بنیاد پر استوار ہوگا تو اس کا محکم و پائدار ہونا یقینی ہے ورنہ اس کی بنیاد ریگِ صحرا پر ہوگی ۔ دراصل اس کا مقصد اقوام کی صحیح نہج پر تربیت ہے تاکہ وہ صحیح لائحۂ فکر و عمل پیدا کریں اور راہ مستقیم پر گامزن ہو کر منزلِ مقصود تک رسا ہوں ۔ وہی زرتشت والی بات : راست گفتار ، راست کردار ، راست پندار ۔ تاکہ اسلام کی اصطلاح میں فقر غیور کے حامل بندۂ مومن پیدا ہوں اور ان کا اجتماع اسلام کے مانند خیر الامم پیدا کرے ۔ اقبال کا نسخہ سب کے لیے نسخۂ شفا ہے ۔ خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ۔ وہ مکارم الاخلاق اور خصائلِ سیرت جن پر بنائے ملت استوار ہو تمام قوموں کے لیے یکساں اہمیت رکھتے ہیں ۔ درس حکیم یہاں بھی وہی ہے جس کی وضاحت ''اسرار و رموز'' میں کی گئی ہے لیکن یہاں مضامین کو موضوع کی مناسبت سے نئے انداز میں ترتیب دیا گیا ہے تاکہ ان کا معاملۂ زیرِ بحث پر براہِ راست اطلاق ہو ۔

ان میں سرِ فہرست حکمتِ کلیمی ہے جس سے مراد اربابِ حق اور انبیاے کرام کی حق پرستانہ رشد و ہدایت ہے جس میں کوئی ریو و ریا، کذب و افترا یا ہوا و ہوس نہیں - اقبال نے ''فلک قمر'' میں رومی کی زبانی پیغمبری کی جو توضیح کی ہے اس میں اہلِ حق ہی کی اہمیت واضح کی گئی ہے جو کسی ذاتی غرض کی بنا پر نہیں بلکہ فلاح کل کے لیے کوشاں ہوتے ہیں - ان کی جد و جہد تمام تر ایک اعلیٰ نصب العین کے لیے وقف ہوتی ہے - بقول زرتشت :

راہِ حق با کارواں رفتن خوش است
ہمچو جاں اندر جہاں رفتن خوش است (جاوید نامہ)

کیونکہ

وحی حق بینندۂ سودِ ہمہ در نگاہش سود و بہبود ہمہ

بندۂ حق کو حق اور صرف حق سے سروکار ہے - اسے تمام نوع انسان کی بہبودی پیشِ نظر ہوتی ہے - اس لیے وہ راہِ حق میں بیباکانہ سینہ سپر ہوتا ہے اور باطل کو ہل من مبارز کی دعوت دیتا ہے - اس کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی ہے اس لیے اس میں کوئی فروگزاشت ممکن نہیں - اور نہ اس میں انسانی رو رعایت اور ذاتی اغراض کو دخل ہوتا ہے - جہاں کل کا فائدہ مدِ نظر ہو وہاں ذیلی یا ضمنی ، ذاتی اور فروعی امور کو دخل بھی کیا ہو سکتا ہے -- ہر رسول سلیم الفطرت انسانوں کی ایک حق پرست جماعت پیدا کرتا ہے -- ایک الٰہی اصول و ہدایت پر کاربند امت - ایسی امت مجاہدانہ روح سے سرشار ہوتی ہے اور سرفروشانہ جد و جہد سے صالح معاشرہ قائم کر کے رہتی ہے - جو

اپنی صلاحیتوں کو اس کے مقاصد کے حصول کے لیے وقف کر دیتی ہے اور اس کے ممکناتِ ترقی کو جلوہ گر کرتی ہے - اس طرح ایک نئی حق و صداقت پر مبنی دنیا آشکار ہوتی ہے -

اس کے برعکس حکمتِ فرعونی ہے - یعنی قاہر و جابر فرماں رواؤں کی حکمت - یہ لوگ اربابِ دیں کے برخلاف اربابِ کیں ہیں - کیونکہ ان کا مقصد خاقِ خدا کی بہبودی نہیں بلکہ ذاتی عز و جاہ اور فر و شکوہ کے لیے خاقِ خدا پر استبداد ہے - وہ زیردست انسانوں کو گلۂ گوسفند خیال کرتے ہیں تاکہ ان کے استحصال سے اپنے جاہ و جلال کو چار چاند لگائیں - ان کی حکمت کا دار و مدار مکر و فن پر ہے - جس میں من مانے طور طریقوں اور قواعد و ضوابط پر زور ہوتا ہے - بنیادی انسانیت نواز اصولوں کو جو کلی بہبود کے حامل ہوں ، نظر انداز کر دیا جاتا ہے - بالفاظ دیگر سرے سے نظامِ حکومت ہی غلط اصولوں پر مبنی ہوتا ہے - اس میں روح کو جسم کی بعض مادی اغراض کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے - ایسی حکمتِ عملی دورِ کہن ہی سے مخصوص نہیں - یہ کسی وقت بھی نمودار ہو سکتی ہے اور تقاضا کرتی ہے کہ کوئی موسیٰ نمودار ہو اور طلسمِ سامری کو پارہ پارہ کر دے - فرعون کا طاغوتی طلسم برباد ہو جائے اور ایک ملت اس کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہو - اقوامِ فرنگ کی صورت میں ایک بار پھر روحِ فرعونی نمودار ہوئی ہے جو محکمی جستن ز تدبیرِ نفاق پر کاربند رہی ہے اور قومی وحدت میں خلل پیدا کرتی ہے - ایسی قوم کی حالت کس قدر افسوس ناک ہے جو حکمتِ فرعونی کے داؤ پیچ کو نہ سمجھے اور

اس کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو جانے لیکن حکمت فرعونی میں کچھ ایسا جادو ہے کہ ملتیں اس کی شعبدہ بازیوں کو سمجھنے نہیں پاتیں اور اس کے افراد اور جماعتیں آپس میں دست و گریباں رہتی ہیں۔ چابکدست حاکم کی شاطرانہ پالیسیوں کے فریب میں آکر وہ اپنے مفاد کو بھول جاتی ہیں اور اپنے حلقہ ہائے زنجیر کو مضبوط سے مضبوط تر کرتی چلی جاتی ہیں۔ ایسی عیارانہ اور سالوسانہ حکومت سے ملت پر تباہ کن اثر ہوتا ہے۔ اقبال نے حکمت فرعونی کے تحت اس کا بھی جائزہ لیا ہے بلکہ یہاں اس حقیقت کو واضح کرنا ضروری ہے کہ "پس چہ باید" کی نوعیت ایک آڑی تراش (Cross Seltion) کی ہے جس میں اقبال نے اپنے یہاں کی ویسٹ لینڈ کا جائزہ لیا ہے۔ آخر دنیائے مشرق ایک وسیع پیمانے پر ویسٹ لینڈ (دیار ویراں) نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایلیٹ کا رمزیہ پیرایہ اقبال کے توضیحی پیرائے سے بہت مختلف ہے جس میں کوئی ابہام نہیں۔ اقوام مشرق میں معاشرے کی حالت زبوں کے خط و خال اس طرح ابھرتے ہیں:

وائے قومے کشتۂ تدبیر غیر
کار او تخریب خود، تعمیر غیر
می شود در علم و فن صاحب نظر
از وجود خود نگردد باخبر
نقش حق را از نگین خود سترد
در ضمیرش آرزوہا زاد و مرد

بے نصیب آمد ز اولادِ غیور
جاں بہ تن چو مردۂ در خاکِ گور
از حیا بیگانہ پیرانِ کہن
نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن
در دلِ شاں آرزوہا بے ثبات
مردہ زایند از بطونِ امہات
دخترانِ او بہ زلفِ خود اسیر
شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر

یہ سب اس لیے ہے کہ اقوام مشرق کے سینے نور ایمان سے خالی ہیں ۔ انھیں زندگی کے سوز و گداز کا احساس نہیں رہا ۔ ان کی نظر اپنے رب پر نہیں ۔ سرکاری ملازمتوں اور دیگر امور میں ان کی تمام حیات غیروں کے لیے وقف ہے ۔ مغربی اثرات نے ان کی شخصیت کو ماؤف کر دیا ہے ۔ وہ جن خانہ زاد صداقتوں اور حقیقتوں کا شعور رکھتے تھے ، ان کو فراموش کر دیا ہے ۔ قدیم صالح اقدار گلدستۂ طاقِ نسیاں بن چکی ہیں ۔ ان حالات میں وہ دوسروں کی دست نگر اور اپنے کل ساز و سامانِ حیات کے لیے منت پذیرِ غیر نہ ہوں تو اور کیا ہوں ۔ کہنے کو تو وہ زندہ ہیں لیکن درحقیقت انھیں مردہ ہی سمجھنا چاہیے ۔ صرف وہ تابوت میں بند یا چتا پر جل نہیں رہیں ورنہ ان کا وجود حیات کی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ دنیا میں موجود نہیں ۔

اگر کوئی قوم حق و صداقت سے جہہ دور ہو ، جس کے معنی ہیں ایک معقول نظریۂ حیات ، ایک نصب العین (اسلامی یا عمومی ؟)

اور اس کو حاصل کرنے کا جذبہ تو پھر اس کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے ؟ یہ محض مفروضہ نہ تھا بلکہ اقبال کے پیش نظر دنیائے مشرق کی حقیقی صورتحال تھی (مرض و علاج کی ٹھوس بنیاد نہ کہ محض گوشۂ خلوت میں فکر آرائی) یعنی مغرب کو شکست دے کر تعمیرِ ملت کی کیا تدبیر کی جائے ۔ شکست کے معنی ہیں لا اور تعمیر کے لا ۔ پہلے نفی اور پھر اثبات ۔ یعنی پہلے یورپ کا تختہ الٹ کر انقلاب برپا کیا جائے اور پھر تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوں ۔ یہ تو ہوئی اس کی ادنیٰ تعبیر ۔ اعلیٰ تعبیر ہے نفی ماسواللہ اور اثبات اللہ ۔ جس کے لیے اللہ بس ماسوا ہوس کا مقولہ مشہور ہے ۔ اللہ کیا ہے ؟ اعلیٰ ترین تصور اور اقدار ــــ الٰہیاتی ، روحانی ، اخلاق ــــ ماسوا اللہ اور دنیائے دنی اس کی نقیض ہے ۔ بقول رومی :

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں ۔ ایں خیال است و محال است و جنوں ۔

اس لیے حیات کی معراج یہی ہے کہ ماسوا اللہ کو اہمیت نہ دی جائے اور اس سے گزر کر خالص یزدانی زندگی بسر کی جائے ۔ جس کے 'لی مع اللہ ، تخلقوا باخلاق اللہ اور سیر فی اللہ' آئینہ دار ہیں اور جس کو اقبال نے دنیا کی ولادتِ اولیٰ کے مقابلے میں ولادتِ ثانی قرار دیا ہے ۔ لہذا لا الا (لا و الا) میں حیات و کائنات کی کلیدی حقیقت اور ماہیتِ کاملہ مضمر ہے ۔ یہ کلمہ ، بقول اقبال 'دو حرف' نظام آفرینش کا سنگِ بنیاد ہے ۔ کون و مکاں میں درون و برون حق ہی حق ہے ۔ ایک واجب الوجود ہستی اعلیٰ و کبریٰ جس کا اعتراف اور تقدیس تمام موجودات خصوصاً بنی نوع انسان پر لازم ہے ۔ کیونکہ عبد و معبود کا رابطہ باہمی اشرف المخلوقات ہی کے

لیے اہمیت رکھتا ہے ۔ کوئی معاشرہ اس وقت تک تندرست و صالح نہیں ہو سکتا جب تک آدم اور حق باہم دگر وابستہ نہ ہوں ۔ اللہ کا اقرار اور لا یعنی مساوا اللہ کی نفی انسان کی بہترین اخلاق و روحانی تربیت کے لیے لازم ہیں ۔ کیوں ؟ ذاتِ باری محض ذات ہی نہیں بلکہ صفات بھی ہے ۔ وہ کامل ترین ہستی ہے ۔ اس لیے اس کی حیثیت مثالی ہے ۔ اس تک رسائی انسانِ کامل بننے کا ذریعہ ہے ۔ کوئی بھی معیار ہو ، کوئی نظریہ ، کوئی مقصد ، کوئی نصب العین ، جب کمال اس کو اپنانے پر موقوف ہو تو ہم جتنے اس سے قریب ہوں گے اتنے ہی کامل ہوں گے ۔ اگر حق تمام صفات و کمالات کا جامع ہے تو ہمارا درجۂ کمال اس تک رسائی پر موقوف ہوگا ۔ یہی فنا فی اللہ بھی ہے اور بقا باللہ بھی ۔ یعنی خود کو جملہ اخلاق و اوصاف میں تمام تر حق کے لیے وقف کر دینا اور اس کے ساتھ کلی مطابقت پیدا کرنا ۔ بالفاظ دیگر یہ نصب العین اور طالب کے یک جان و دو قالب ہو جانے کے مترادف ہے ۔ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری (مرتبۂ عین) ۔ اگر اس توقیف اور ہم آہنگی میں کسی بھی وجہ سے کوئی بھی خلل واقع ہوگا ــ شرع کی اصطلاح میں اسے شرک کہتے ہیں ۔۔ تو تکمیلِ انسانیت میں بھی کسر رہ جائے گی ۔ حق سے کلی وابستگی غیر حق سے وابستگی کے بغیر محال ہے ۔ اس حقیقت سے کسی طرح انکار ممکن نہیں ۔ جب ہم حق سے دامانِ تعلق وابستہ کر لیں گے تو ظاہر ہے ہم کسی اور طاقت ، کسی غیر حق تصور یا مخالف اصول کو اختیار نہیں کر سکتے ۔ لہٰذا الا عظیم اپنانے پر واحد ہستی ، واحد حقیقت ، واحد معیار ، واحد صفات حسنہ کا

اقرار ہے اور لا اس کے سوا تمام امور سے انکار ۔ خواہ وہ نصب العین ہو یا معیار ، اصول ہو یا اخلاق ، تصور ہو یا نظام ۔ مطلب یہ کہ اوصافِ حمیدہ کا مثبت و مطلق اقرار اور آن تک رسائی کی جہدِ کاملہ ۔ صاف لفاظ میں اپنے اندر اعلیٰ ترین اوصاف کی پرورش اور نشو و نما ۔ صریحاً یہ مثبت پہلو سراسر تعمیری ہے ۔ یعنی جب ہم صفاتِ کمال اور اوصافِ حمیدہ کو اپنا مطمح نظر ٹھہرا لیتے ہیں تو ہم زندگی کو عمدہ سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں جو ایک تعمیری لائحۂ عمل ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر خدا کوئی نہیں تو ہمیں مجبوراً خدا بنانا پڑے گا ۔ کیونکہ زندگی کسی مقصد کے بغیر محال ہے ۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نظریۂ اشتراک ہی الٰہ ہے اور اس کے معتقدین کو اسی کے مطابق اوصاف پیدا کرنے لازم ہیں ۔ بدھ مت غیر الٰہی ہونے کے باوجود اپنے تصور کی حیثیت سے الٰہی ہے ۔

لہذا اولاً یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ ہم ان تمام امور کی نفی کریں جو مثالی معیار کے نقیض اور اس تک رسائی میں سدِ راہ ہیں اور جنھیں اصطلاحاً غیر اللہ یا ماسوا اللہ کہا جاتا ہے ۔ ہمارے سامنے دو چیزیں ہیں ، حق اور غیر حق ۔ اور دونوں میں سے ایک ہی کا انتخاب ممکن ہے ۔ لہذا اول غیر حق کا بطلان اور شکست (لا) لازم ہے ۔ اس کے بعد ہی ہم حق کی طرف رجوع ہو سکتے ہیں اور اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ پیدا کر سکتے ہیں ۔ غالباً قبل ازیں اقبال کے افکار ، خصوصاً لا و الا کے تصورات کی اس پیرائے میں توضیح نہیں کی گئی ۔ اس لئے ان کا حقیقی مفہوم واضح نہیں ہو سکا ۔ موجودہ

پیرائے میں غور کرنے پر ان کا مدعا کھل کر سامنے آ جاتا ہے اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اقبال کوئی بڑی دقیق ، ماورائی قسم کی باتیں نہیں کہہ رہے بلکہ صرف اتنا کہہ رہے ہیں کہ زندگی میں تخریب اور تعمیر دونوں کی ضرورت ہے ۔ اول ناسوزوں ، فاسد عناصر جو ہمارے آدرش کے خلاف ہوں ، ان کی بیخ کنی لازم ہے ۔ یا پھر فرد اور جماعت کو اپنی تطہیر کرنی چاہیے تا کہ وہ تعمیر کی طرف قدم بڑھا سکیں ۔ اسی لیے لا کو جلال کہا گیا ہے ۔ یعنی قہاری جس کے ذمے شکست و ریخت ہے اور الا کو جمال کیونکہ اس میں منفی سے گزر کر مثبت اقدار ، مثبت افعال اور تعمیری کارروائی کی طرف رجوع ہوتا ہے اور زندگی میں نفاست اور تناسب پیدا ہوتا ہے ۔ وہی جسے قرآن میں 'احسان' کہا گیا ہے ۔ لا کا قدرتی نتیجہ حرکت ہے کیونکہ تخریب سے جد و جہد ، کشمکش اور تصادم کی جملہ صورتیں رونما ہوتی ہیں ۔ لا کے مقابلے میں الا امن و سکون کی حالت ہے ۔ فرد کے لیے نفسِ مطمئنہ اور جماعت کے لیے امن و امان کا تعمیری دور ۔ لہذا جب کوئی نیا تصور ، نیا نظریہ ، نیا عقیدہ رونما ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ برہمی و درہمی کا سامان لاتا ہے ۔ معاشرے میں ایک دم ہلچل پیدا ہو جاتی ہے اور پھر حرب و ضرب کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس میں ایک ملک دوسرے پر غالب آ جاتا ہے اور اس کے دوران میں وہ انتشار جس کا ذکر شیکسپیر نے کیا ہے : 'پرخطر کام کی تکمیل اور اس کی ترغیب ، ان کے مابین جو وقفہ ہے وہ کوئی ہتوا ہے یا خراب ہے وحشت افزا ۔

چونکہ حیات کا شدید احساس عمل ہی سے ہوتا ہے ، اس لیے

جتنا ہنگامہ شدید ہوگا اتنا ہی زندگی اور توانائی کا زیادہ احساس ہوگا۔ اقبال اسی لیے لا کو اس قدر پسند کرتے ہیں۔ وہ اقوامِ مشرق میں جمود کا غلبہ پا کر ان میں لا کو کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ایک نیا جنوں، نیا ویرانہ یعنی نصب العین اور نیا جذبہ و جوش پیدا کیا جائے۔ وہ قیامت کے خواہاں ہیں جو حرکت اور ہنگامہ آرائی کی علامت ہے۔ کیونکہ اس وقت اقوامِ مشرق کو سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے۔ حقیقی زندگی شعائر کی رسمی، بے روح پیروی پر نہیں بلکہ ایک نئی لگن، نئی تڑپ پیدا کرنے پر موقوف ہے۔ وہ روس کی اشتراکی تحریک کے اس لیے حامی ہیں کہ اس میں لا کارفرما ہوا ہے جس نے نظامِ کہن کو پاش پاش کر دیا گیا ہے۔ کیا اشتراکی نظام عملاً بھی موزوں ثابت ہوگا یا نہیں۔ کہیں اس کی جمہور نوازی میں پھر قیصریت اور ملوکیت تو در نہیں آئے گی، ایک اہم سوال ہے۔ اقبال کو شکست و ریخت کا بے پناہ شوق ہے اور وہ اس کا ذکر نہایت ولولہ انگیز پیرائے میں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں علم الاقتصاد کے مطالعے کو بھی دخل ہے جس نے محنت و سرمایہ کی باہمی کشمکش کے تصورات کو فروغ دیا ہے۔ تاہم اشتراکیت کے متعلق اقبال کا جوش و خروش وسوسوں سے خالی نہیں:

اگر تاج کئی جمہور پوشد   ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
نماند ناز شیریں بے خریدار   اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

اگر وہی ہنگامے یعنی وہی عدم مساوات اور عدم انصاف کا دور دورہ رہا تو لا کی یہ ساری ہنگامہ آرائی بے کار ثابت ہوگی۔ اسی لیے وہ

سعید حلیم پاشا کی زبانی ملتِ روسیہ کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ :

تو کہ طرح دیگرے انداختی دل ز دستورِ کہن برداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں قیصریت را شکستی استخواں
تا برافروزی چراغے در ضمیر عبرتے از سرگذشتِ ما بگیر
پائے خود محکم گذار اندر نبرد گرد ایں لات و ہبل دیگر مگرد
کردۂ کارِ خداوندان تمام بگذر از لا جانب الا خرام

اس کے بین السطور میں (عبرتے . . .) میں ایک غور طلب ، چونکا دینے والا اعتراف ہے جس کے مضمرات بہت وسیع ہیں ۔ جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے ، وہ احتمالات جن کا اقبال کو اندیشہ تھا ، بے بنیاد ثابت نہیں ہوئے ۔ کیونکہ اب مارکس اور اینجلز کے بعض پیرو بھی اپنے نظام پر نظرِ ثانی کے جویا ہیں اور لات و ہبل پھر کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہو گئے ہیں ۔ کیونکہ قیصریت کے استخواں کافی سخت ہیں ۔

اقبال اقوامِ مشرق کو عرصۂ حیات میں صبا رفتار دیکھنا چاہتے ہیں ۔ وہ مشرق کی خوابیدہ ملتوں کو از سرِ نو بیدار اور قیامت برپا کرتے دیکھنے کے خواہاں ہیں ۔ اگرچہ اب مرورِ زمانہ سے مشرق و مغرب کے امتیاز کے علاوہ شمال و جنوب ، اشتراکی و غیر اشتراکی ، سفید ، سیاہ ، زرد ، رنگدار جیسے امتیازات بھی پیدا ہو گئے ہیں ۔

اقبال کو قیامت کا لفظ بے حد پسند ہے کیونکہ یہ خواب مرگ (ذاتی اور اجتماعی جمود اور کسلمندی) سے بیدار ہونے کی علامت ہے ۔ ان کے نزدیک حقیقی حشر یہی حشرِ ملت ہے ۔ جس

قوم کے سینے میں جوالا مکھی کی طرح یہ لاوا ابل رہا ہو اس کی ہستی دوسروں کے لیے باعثِ خوف ہے :

ہر کرا ایں سوز باشد در جگر　　ہولش از ہولِ قیامت بیشتر

مرکیشو کے آخر میں اقوامِ مشرق کو واشگاف الفاظ میں تحریک دلائی گئی ہے کہ :

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیش ایں نمرود زن
ایں کہ می بینی نیرزد با دو جو
از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دستِ او شمشیر لا ست
جملہ موجودات را فرماں رواست

مطلب یہ کہ بے باکانہ علمِ بغاوت بلند کر دو ۔

یہ تو درست ہے کہ انسان شمشیر لا بکف ہو لیکن سوال صرف دست و بازو کا نہیں ۔ شمشیرِ لا وہی اٹھا سکتے ہیں جن میں یداللہی ہو اور یداللہی درحقیقت خودی کا ارتقائی نقطۂ عروج ہے ۔ جب انائے انسانی انائے کبریائی سے بدرجۂ اتم قریب ہو جاتی ہے تو مسئلہ یہ صورت اختیار کر لیتا ہے کہ خودی کی تربیت کیسے کی جائے ۔ اس کے اسباب ستحکام کیا ہیں ۔ اسرارِ خودی میں اس کی بالتفصیل وضاحت کی گئی ہے ۔ ''پس چہ باید'' میں یہی توضیح ''فقر'' کے زیرِ عنوان کی گئی ہے ۔ یعنی ایمان و ایقان اور روح غازیانہ جن سے فقر ظہور پذیر ہوتا ہے ۔ اس سے انسان آب و گل کی حد بندیوں سے

آزاد ہو کر ابھرتا ہے - اس کے لیے نگاہِ راہ بیں یعنی بصیرت و حق پرستی اور دلِ زندہ یعنی حرارتِ ایمانی کی ضرورت ہے - بالفاظ دیگر انسان کا اللہ سے تعلقِ خاطر اور ماسوا اللہ سے قطع نظر - اس دو حرفِ لا الٰہ پیچیدن ، سے یہی مراد ہے اور اس صیقلِ روح سے جو شخصیت آشکار ہوتی ہے وہ حیدرِ کرار کی شخصیت ہے جس کے سامنے شدید سے شدید مہمات بھی کوئی معنی نہیں رکھتیں - جس مردِ فقیر کا اقبال ذکر کرتے ہیں وہ ہمارے مربھکے فقیر نہیں اور نہ محض روحانیون ہیں :

موئینہ بہ بر کردی و بے ذوق تپیدی
زانگونہ تپیدی کہ بجائے نہ رسیدی

بلکہ وہ مردانِ مجاہد ہیں جو تسخیر کے مردِ میدان ہیں : قلب او را قوت از جذب و سلوک -

ہمارے اپنے دور میں قائدِ اعظم کوئی مردِ فقیر نہ تھے لیکن ان میں وہ تمام مجاہدانہ اوصاف تھے جو بڑی سے بڑی طاقتوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور اپنا کامِ شوق حاصل کر کے رہتے ہیں -

جب فقر درحقیقت ذوقِ جہاد ہے تو پھر اقوامِ مشرق گوشہ نشیں اور خلوت گزیں کیوں ہیں ؟ وہ رہبانیت اور حجرہ نشینی جو ان کا شعار بن چکی ہے ، ان کے لیے زہرِ قاتل ہے - اقبال یہ کہہ کر ان کو ابھارتے ہیں کہ وہ میدانِ عمل میں قدم رکھیں اور قیامت پیدا کریں :

فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است
فقرِ مومن لرزۂ بحر و براست !

موجودہ دور میں نہیں کوئی بھی دور ہو ، درحقیقت خودی محض خدا جوئی نہیں بلکہ خود جوئی ہے - یہ ترکِ بدن سے خدا کی تلاش نہیں بلکہ خودی کو حق سے جلا دے کر تیغِ آبدار بنانا ہے - یعنی کسی امرِ حق یا نصب العین کو اپنا کر اسے حاصل کرنے کی جد و جہد - جب مسلمانوں میں اس قسم کا جید فقر نابود ہو گیا تو ان کی روحانی توانائی کافور ہو گئی - ان میں وہ جلال اور کراری و قہاری نہ رہی ، اس لیے وہ دوسروں کا تختۂ مشق بن گئے - آخری شعر خاص طور پر پُرمعنی ہے :

بر عیارِ مصطفےٰ خود را بزن

مطلب یہ کہ پیغمبرِ اسلام کی پیروی کے معنی ظواہر کی پیروی نہیں بلکہ ان میں مجاہدانہ جذبہ و جوش پیدا کرنا ہے - ہماری روش موجودہ حالات کے مطابق انقلابی اقدام ہے - یہی حقیقی اسلام ہے - ایک متوازی کارروائی نہ کہ فروعات کی تقلید - اقوامِ مشرق کو اسی ہم وضع اقدام کی ضرورت ہے جس کا محرک جذبۂ جہاد ہے - تا کہ ہم دوبارہ اقتدار حاصل کر کے اپنی پستی کو بلندی میں تبدیل کر دیں -

ظاہر ہے کہ اقبال کی دانست میں حق کی واحد صورت عیارِ مصطفےٰ ہے - یعنی وہی سرشت پیدا کرنا جس سے حقیقی باتصرف ، فعال زندگی رونما ہوتی ہے - 'دو رکعت' کی ادائگی نہیں - کیا اس پیروی یا غیرتِ دیں کا غیر مسلموں پر بھی اطلاق ہے ؟ اگر ہے تو

اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اقبال ہنود یا یہود کو بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے دین پر پوری طرح کاربند رہیں ، اسی کی طرف رجوع ہوں اور وہی سوزِ کہن پیدا کر لیں جو قدیم ہنود یا بنی اسرائیل کی روح و رواں تھا ۔ غالباً نظری طور پر وہ اس کے ضرور قائل تھے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر یہ معاملہ عملاً سامنے آتا تو ان کا رویہ کیا ہوتا ۔ غالباً یہ وسیع المشربی ان کے تصور سے متجاوز تھی کیونکہ ان کی ملتِ اسلامیہ کے ساتھ وابستگیاں بہت شدید تھیں ۔ دراصل اقوامِ مشرق کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ذہن میں مسلمان ہی پیش پیش تھے ۔ اس لیے غیرت دین یعنی نظام کہن کی تجدید انہی تک محدود تھی ۔ دوسرا ہی مصرع اس کی فی الفور تائید کرتا ہے :— اے مسلمان مردن است این زیستن علاوہ بریں ایک اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'حق' من و عن سلف کا 'حق' ہے یا کچھ اور ۔ پہلی صورت میں صرف احیا ہی کی گنجائش ہے اور احیا کے معنی ہیں اعادہ جو قدرتی طور پر اصل کی طرح اجتہادی ، خود خیز اور توانا نہیں ہو سکتا ۔ اس کی نوعیت مقامی ، ذیلی اور اخّاذ ہوتی ہے ۔ غیر مسلم مشرق کے لیے یہ سوچنا ہوگا کہ وہ کس بنا پر احیائے حق کرے اور اس کے لیے بھی قاہری کا طریق قابلِ تسلیم ہوگا یا نہیں ۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مشرقی قوم بھی اپنے طور پر احیائے دیں کرے تو کیا اقبال کو یہ منظور ہوگا ؟ اور ملت کی ترقی میں کوشاں ہو تو اس سے کیا نتیجہ رونما ہوگا ؟ اقوامِ مشرق کے مسائل حل ہو جائیں گے یا ان میں کوئی اور پیچ پیدا ہوگا ؟ یعنی ایک قوم کی خودی کا دوسری قوم کی

خودی سے ٹکراؤ ۔ برصغیر میں رجعتِ قہقری اور اسرائیل میں صیہونیت کا عروج اس پیچیدگی کی دو صورتیں ہیں ۔ کیونکہ دونوں نے اپنی اپنی خودی کو بلند کیا ہے ۔ اگر اقبال زندہ ہوتے تو کیا وہ ان دونوں تحریکات کے متحمل ہوتے ؟ شدھی ، سنگھٹن اور اس سے پہلے سیواجی کی تحریک سبھی اسی نہج پر تھیں ۔ اور ان کے متعلق اقبال کا رجحان ''ترکش ما را خدنگ آخریں'' اور تحریکِ پاکستان کی حمایت ہی سے ظاہر ہے ۔ یک جگہ انھوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ انھیں اس مذہب پر کیوں فخر نہ ہو جس نے انھیں اپنے بےمثال فیضان کی نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا ہے ۔

دراصل اقبال کے عہد تک صورتحال کچھ اور تھی ۔ اس وقت مدِ مقابل مغرب تھا اور اقبال اپنی مخصوص وابستگی کے باعث مشرق ہی کی طرفداری کر سکتے تھے ۔ انہیں قوامِ مشرق کا احیا ے ثانیہ مقصود تھا ۔ جب کہ اقوامِ مشرق کی اکثریت مسلم اقوام کے مترادف تھیں ۔ غیر مسلم اقوام سے قطع نظر خود مسلم اقوام کی پیش خودی کہاں تک سازگار ثابت ہو گی ، بعید از تصور تھی ۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی عرب اور ترکی کی مثال موجود تھی ۔ اور اب پختونستان کی تحریک اور بنگلہ دیش نے اس کی توثیق کر دی ہے ۔ اس وقت ذہن پر یہی خیال حاوی تھا کہ مسلم اقوام میں ، خواہ وہ کوئی ہوں ، اتحاد و یگانگت طے شدہ بات ہے ۔

مسلمانانِ ہند کے زوال کے بارے میں بھی اقبال نے رائے عامہ کی تصدیق کر دی ہے ۔ وہ ترکِ دین کو تنزل کا واحد سبب قرار دینے میں حالی ، شبلی ، اکبر وغیرہ کے ہمنوا ہیں ۔ تاریخی حیثیت

سے ترک دیں کا ثبوت فراہم نہیں ہوتا کیونکہ برِ صغیر کے مسلمانوں نے دین ہی کی بنا پر زبردست محاربہ آرائی کی اور ان کی جرأت و بسالت کا خود فرنگی ماہرینِ حربیات کو اعتراف کرنا پڑا ۔ مسلمانوں کی شکست میں گوناگوں اسباب کو دخل تھا جس میں قدم قدم پر "کالی بھیڑوں" کا کردار کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا ۔ ہر قوم میں جعفر اور صادق ملی مفاد کو ذاتی اغراض کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں ۔ خود سقوطِ دہلی میں بھی خانگی ریشہ دوانیوں اور رقابتوں کو کیا کچھ دخل نہیں رہا اور متحدہ قومیت کا تصور نہ ہونے کی وجہ سے خود مقامی عناصر نے انگریزوں کو فتحیاب ہونے میں کیا کچھ مدد نہیں دی ۔ باقی رہا وہ جذبہ و جوش جسے اقبال حقیقی اسلام کی روح و رواں قرار دیتے ہیں تو وہ بھی تب سے اب تک اپنی پوری شدت کے ساتھ کارفرما رہا ہے ۔ رسم و رواج کی تہہ میں یہ لاوا برابر ابلتا رہا ہے اور اپنی موجودگی کا ثبوت دیتا رہا ہے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ رسمیں ریتیں زندگی کا جزو نہیں اور دنیا کی کوئی قوم بھی ان سے آزاد ہے یا زیادہ دیر ان سے بیگانہ رہ سکتی ہے ۔ اسبابِ زوال کا پتہ چلانے کے لیے ہمیں حالات و واقعات کو زیادہ گہری نظر سے دیکھنا ہوگا ۔

اقبال نے جن حالات میں اقوامِ مشرق کی حمایت اور سربلندی کا بیڑا اٹھایا وہ آج بھی موجود ہیں بلکہ دورِ جدید انھی کا سلسلہ جاری ہے ۔ دنیائے اسلام آج بھی انھی خرخشوں اور کشمکشوں میں مبتلا ہے ۔ اور انھیں کسی اتحاد پرور پیغام کی اشد ضرورت ہے جو انھیں متحدہ محاذ پر لا کھڑا کرے اور مشترکہ مفادات کے لیے

ملتِ واحدہ کے طور پر سینہ سپر ہونے کی تحریک دلائے۔ حال ہی میں کچھ ایسے رجحانات تو پیدا ہوئے لیکن ساتھ ہی خود بخود یا اغیار کی انگیخت پر چپقلشیں اور مخالفتیں بھی برابر مدِ راہ رہیں۔ مشترا کیت کے فروغ نے اور بھی ناچاقی پیدا کر دی ہے اور ہر ملک خانہ جنگی سے دوچار ہے۔ ایسے میں ملتِ واحدہ اسلامیہ کا احساس کیسے پیدا ہو اور دین کس طرح بنیانِ مرصوص ثابت ہو۔ تاہم اقبال کا پیغام عرب و عجم اور مشرق و مغرب میں دور دور تک پہنچ چکا ہے۔ اور ان کا آہنگ رجز اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ ہر صغیر کی حد تک تحفظِ خودی کی تعلیم اور اس کا نعرہ قیامِ پاکستان کا باعث ہوا۔ اگر اقبال کا پیغام جو "پس چہ باید کرد" میں پوری وضاحت سے پیش کیا گیا ہے، کارگر ثابت ہوا تو اس سے وسیع نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کی آواز برابر فضاؤں میں گونج رہی ہے اور آنے والے لمحات ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ روح کو گرمانے اور قلب کو تڑپانے میں کہاں تک مددگار ثابت ہوگی۔ اس سلسلے میں مخالف نظریات اور مفادات نیز بین الاقوامی طاقتوں کے اثر و نفوذ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جس کا ہمیں اب تک کافی تجربہ ہو چکا ہے۔

اقبال نے فقر کے زیرِ عنوان اس ضد فقر کا بھی ذکر کیا ہے جس نے مسلمانوں کو اس قدر خستہ و درماندہ بنا رکھا ہے۔ وہ ان کا عبرتناک نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

از سہ قرن ایں امتِ خوار و زبوں
زندہ بے سوز و سرورِ اندروں

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق
مکتب و ملائے او محروم شوق
زشتیٔ اندیشہ او را خوار کرد
افتراق او را ز خود بیزار کرد
تا ندانہ از مقام و منزش
مرد ذوق انقلاب اندر دلش

مختصر یہ کہ ہم لوگ اپنے ملی نصب العین سے بیگانہ ہیں اور اغیار کے مقاصد کو پورا کرنے کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں ۔ احساسِ ملی کا تقاضا ہے کہ ہم اس جبر سے اختیار کی طرف آئیں اور وہ آزادانہ فکر و عمل کی صلاحیت پیدا کریں جو ایک زندہ ملت کی علامت ہے ۔ اس کا سرچشمہ وہ فقر ہے جو قہاری و سلطانی سکھاتا ہے اور جس سے مردِ حر کی سخت کوشی ، سرفروشی اور پاک شخصیت وجود میں آتی ہے ۔ نہ طوفان حوادث سے ترساں نہ موت سے ۔ وہ مصطفٰی کی سراپا جہاد روح سے سرشار ہے ۔ اس کا دستِ قدرت قوموں کی تقدیر ، ان کی تکبیر کا ضامن ہے — عبدہٗ -- وہ جس کی زندگی تمام تر حق کے لیے اور عینِ حق ہے — اس کی فطرت کی بلیغ ترین تشریح ہے ۔

سلطان شہید کو اس کی کیا پروا کہ اس کی سلطنت ، دنیاوی ساز و سامان اور خود اس کی زندگی باقی رہتی ہے یا نہیں ۔ وہ تو راہِ حق میں جانسپاری کو انتہائی سعادت اور نعمتِ عظمٰی تصور کرتا ہے ۔ اقبال کا مقصد خاک میں شرار پیدا کرنا ہے ۔ ایک ایسی توانائی جو فقر و غنا سے بے نیاز ہو ۔ اس لیے کہ :

جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

یہاں قدرتی طور پر سوال ان اقدار اور اصول و آئین کا پیدا ہوتا ہے جو انسانوں کو معاشی اور معاشرتی امور میں صحیح راہ دکھاتے ہیں ۔ ایک بنیادی مسئلہ پونجی واد اور بے پونجی کا ہے ۔ جو ہمیشہ نا برابری ، نا ہمواری اور نا انصافی کو جنم دے کر بے اندازہ تلخیوں ، بد مزگیوں ، کشا کشوں اور خوں ریزیوں سے زندگی کو نا خوشگوار بنا دیتا ہے ۔ لہذا درسِ خودی کا ایک اہم جزو مال و زر اور اکل حلال وغیرہ کے بارے میں شرعی ہدایات اور تاکیدات ہیں ۔ ہمارے دور میں بندہ و مزدور اور محتاج و غنی کی پرخاش نے جو تنازعات پیدا کیے ہیں اور دامنِ حیات کو خون سے بری طرح داغدار کیا ہے ، وہ تاریخِ انسانی کا ایک المناک باب ہے ۔ اور یہ کشمکش ہر دور میں کسی نہ کسی طرح رنگ لاتی رہی ہے ۔ خواہ یہ بردہ فروشی کی شکل میں ہو یا زیر دست کمیوں اور شوریدہ حال مزارعین وغیرہ کی زبوں حالی کی شکل میں خواجگی و بندگی کا امتیاز آج بھی دامنِ انسانیت پر بدنما داغ ہے جس کی گوناگوں صورتیں ہیں ۔ با ثروت ممالک کی امدادی رقوم اور قرضہ جات غلامی کے کیا کیا امکانات پیدا نہیں کرتے ۔

اقبال اسلامی مساوات کے جذبہ سے سرشار بندہ و آقا کے امتیاز کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے ہیں ۔ ان کا کلام ایسے اشارات سے پر ہے جن میں اس مکروہ داغ کو ملیامیٹ کر دینے پر زور دیا گیا ہے :

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

''اسرار شریعت'' میں اس پورے ضابطۂ حیات کا تذکرہ ہے جو نبوت ہم کو عطیۂ آخری کے طور پر عنایت کر گئی ہے ۔ اقبال آدم دری کے برعکس آدم گری کے قائل ہیں ۔ وہ امنِ عالم جو اسلام کا مقصود ہے ، اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب نسل ، رنگ ، خون ، ذات پات ، مال و منال کے تمام امتیازات مٹا دیے جائیں ۔ تمام انسان برابر ہوں ۔ نہ کوئی طبقہ نہ کوئی علاقائی تفریق نہ کوئی بندہ نہ کوئی بندہ نواز ۔

یہاں یہ واضح کرنا ضروری تھا کہ شرع سے مراد ظواہر ، رسمیں ریتیں اور نذر و نیاز نہیں ۔ حقیقی شرع تو وہ ہے جو زندگی کی گہرائیوں (اعماقِ حیا) سے بلند ہوں اور ان میں زندگی کی کسک نظر آئے ۔ ورنہ بے روح ، اندھا دھند پیروی ناکارۂ محض ہے ۔ وہ حیات انگیز نہیں حیات کش ہے ۔ بقول رومی :

بر ہلاک امت پیشیں چہ بود زانکہ بر جندل گماں بردند عود

اگر ہم پوست کو مغز سمجھ کر اپنائیں تو یہ سراسر قشریت ہے ۔ تجزیہ کرتے کرتے آخر بات یہاں آ رہتی ہے کہ شرع راہ و رسم ملائی نہیں ، حقیقت آرائی ہے ۔ در نظر رو در نظر رو در نظر ! یہ ہے حقیقی زندگی کی واحد شرط ۔ یعنی وہی حقیقتوں کی حقیقت ۔ خودی — جو دل زندہ کی تفسیر ہے ۔

بنیادی صداقت پر ارتکاز توجہ کا نتیجہ وحدت ہے جو ہمیں ظنون و ظن کے لازمی نتائج ، خلفشار اور انتشار سے نجات دلاتی ہے ۔ اس لیے وہ صداقت کے سرچشمہ ، قرآن پر عمل کرنے کی تاکید کرتے

ہیں - قرآن پر عمل کے معنی قرآن خوانی نہیں جس سے ہم پھر باطن کی بجائے ظاہر میں کھو جاتے ہیں - قرآن کتاب نہیں عین حیات ہے - ملا و مکتب کے مسئلے مسائل کا دفتر نہیں - اس کا حقیقی مقصد حیات کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونا ہے - جبھی اقبال نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر پیکارِ حیات میں مذہب ہمارے کام نہیں آتا تو یہ بے کار ہے - اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے تیغ کو چھوڑ کر نیام کو پکڑ لیا ہے - توحید زندہ مسئلہ یعنی حیات پرور ہونے کی بجائے مسئلۂ علم کلام بن کر رہ گئی ہے - ہم توحید کو حق پرستی اور ملی وحدت کا نقیب نہیں ، محض عقیدہ یا نظری بحث خیال کرتے ہیں - کہاں زندگی اور کہاں علم کتابی -

اقبال نے اس موقع پر اصل نقل میں امتیاز کرنے پر زور دیا ہے اور ان تمام عناصر کا پردہ فاش کیا ہے جو دین کو رسوم اور شعائر کا طومار بنا دیتے ہیں - ملا ہوں یا صوفی دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور عہدِ حاضر نے ان ظاہر پرستوں میں ایک خود پرست بھی شامل کر دیا :

عصر ما پیغمبرے ہم آفرید   آں کہ در قرآں بغیر خود ندید

اصل چیز جو قوموں کو زندہ رکھتی ہے وہ کوئی زندہ تمنا ، کوئی حقیقی نصب العین ، کوئی بندۂ حق ہے جس کی کارفرمائی عمل سے آشکار ہو سکتی ہے -

اقوامِ مشرق میں اہلِ ہند سب سے قریب تھے — ہندو اور مسلمان اور اقبال قدرتی طور پر ان کی چشمکوں ، رقابتوں اور نفرتوں کے

درمیان ہی جی رہے تھے - اس لیے ابتدا میں ان کی توجہ انھی پر مرکوز رہی اور اس دور میں جابجا ہندیوں کے باہمی نفاق کا تذکرہ ہے - ''جاوید نامہ'' میں بھی یہی پکار ہے - کہیں بھرتری ہری کے ساتھ بات چیت میں اور کہیں ہند کی ''حورے پاک زاد'' کی بپتا میں - اگرچہ وہ بہت دیر ہوئی خود دونوں کی علیحدگی کی تجویز پیش کر چکے تھے - ''پس چہ باید'' کا مقصد چونکہ اقوامِ مشرق کو بر محل پیغام دینا ہے ، اس لیے اس پکار نے مشاورتی رنگ اختیار کر لیا ہے - ابتدا میں اس حالت زبوں کا منظر پیش کیا گیا ہے جو غلامی سے رونما ہوتی ہے اور جس کی مکمل توضیح ''بندگی نامہ'' میں کی گئی ہے :

پیر مرداں از فراست بے نصیب — نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر — خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

پیغام یہاں بھی وہی ہے کہ اوروں کی بجائے اپنا بنایا جائے - ہم غیر اللہ کار نہ بنیں - اپنے وجود کو غیر سے الگ رکھیں - اس کے سیاسی و معاشی ہتھکنڈوں میں نہ آئیں اور آزادی حاصل کر کے اپنے آدرش کے مطابق زندگی بسر کریں - ہم صحیح معنوں میں زندہ بن جائیں - یہ پیغام ہندی مسلمانوں کے لیے یکساں ہے - طفیلی زندگی کوئی زندگی نہیں - کیونکہ بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب — اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی - خود اختیاری ، خود سازی لازم ہیں - غلام ہونے کے معنی ہیں مردہ بہ مشکل زندہ - غلام قوم کی حالت عبرتناک ہے -

برصغیر میں اسلام نے بحیثیت غیر قدم رکھا تھا۔ اس لیے ابتدا ہی پیکار سے ہوئی۔ قائدِ اعظم کے الفاظ میں جب یہاں پہلا شخص مسلمان ہوا تو مسلم قومیت کی بنیاد پڑ گئی اور دو قومیں ظہور میں آئیں۔ جو صدہا سال گزر جانے کے باوجود برسر پیکار رہیں۔ آخر انگریز دست و گریباں حریفوں کے مابین ثالث بن گئے۔ مگر یہ ثالثی بھی کیا تھی۔ یہ تو الٹی پھوٹ کو ہوا دینے کی بات تھی۔ ستم یہ کہ کسی کو بھی یہ احساس نہ تھا کہ با شرف زندگی کیا ہے۔ یہ محض جئے جانے ہی کا نام ہے یا یہ کہ ہم ایک غیر قوم کے زیر سایہ بظاہر امن چین سے زندگی بسر کریں۔ یہ خام خیالی جلوۂ آب نہیں سراب ہے۔ اقبال اس ذہنیت کو یک قلم بدل دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے بندوں کو دل زندہ پیدا کرنے کی تحریک دلائی۔ دل زندہ آب و گل سے ممیز ہے جس کو "جاوید نامہ" میں بالتفصیل واضح کیا گیا ہے۔ مگر دلِ زندہ کا خود نگر ہونا ہی نہیں اللہ مست ہونا بھی لازم ہے جس سے تان پھر دین و ایمان پر ٹوٹتی ہے۔ قلندری، درویشی، روحانی جذبہ و جوش۔ اقبال کے نزدیک قوموں کے ہر مرض کا واحد علاج یہی ہے۔

آزادی کے مطلوب و محبوب ہونے میں شک نہیں لیکن جب کوئی قوم ایک بار غلامی کے پھندے میں پھنس جائے اور صیاد اس کے حلقوں کو اور بھی کستا جائے تو حصولِ آزادی کی جد و جہد خاصی دشوار ہو جاتی ہے اور انسان حکمران کی ان سیاسی کارروائیوں کے فریب میں آ جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اس کے ہتھکنڈوں سے خبردار رہیں۔ اقوامِ غالب کی سیاست تمامتر فریب

ہے ۔ اس کی بنیاد خود غرضی پر ہے ۔ داناؤں نے سیاست کو اندھی قرار دیا ہے کیونکہ وہ کسی کے نفع و نقصان کی پروا نہیں کرتی اور اپنے مصالح و اغراض کے پیشِ نظر دوسروں کو فریب میں ڈالتی ہے ۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ جمہور زور پکڑ رہے ہیں تو ملوکیت کا چہرہ ڈھانپ کر اسے کوئی اور مسحور کن نام یا وضع عطا کر دی ۔ مثلاً سلطنت کیا ہے ؟ بھائی چارے سے انتظامِ ملک ۔ اس طرح سلطنت کو جامع اقوام یعنی قوموں کا اشتراک باہمی قرار دے کر سادہ لوح انسانوں کو یہ فریب دیا جاتا ہے کہ وہ بھی کاروبارِ حکومت میں شریک ہیں ۔ جیسے کسی حیوان کو رام کر کے اپنا ہم نفس قرار دیا جائے ۔ اہلِ مشرق کو لازم ہے کہ وہ اس قسم کی چکنی چپڑی ، لبھانے والی جو فروش باتوں پر نہ جائیں اور دھوکے میں آ کر مطیع فرمان نہ بنیں ۔ جدید سیاست ایسے ہی دوہرے الفاظ کا مجموعہ ہے جس کے اوپری معنی اور ہیں اور اندرونی کچھ اور ۔ جس سے کم نظر انسان دھوکا کھا جاتے ہیں ۔ حکمران قوم کے فقروں میں آنے کی بجائے ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا ، ان سے متصادم ہونا صحیح اقدام ہے ۔ رہنمایانِ قوم کا فرض یہ ہے کہ وہ آزادہ رو ہوں اور کسی بھی ذاتی غرض سے بے نیاز ، مال و جاہ کی ترغیب و تحریص سے ماوراء حالاتِ زمانہ کے نباض اور تقاضوں سے پوری طرح آشنا ہوں ۔ قدرت نے ان کو دلِ گرم ، نگاہ پاک ، جان بے تاب ، بصیرت اور وسعتِ نظر عطا کی ہو ۔ وہی اوصاف جو قدرت نے بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم کو عطا کیے تھے ۔ جو درویش نہ ہوتے ہوئے بھی فقر غیور سے بہرہ ور تھے ۔ آخر میں کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ

عید آزاداں شکوہ ملک و دیں عید محکوماں ہجومِ مومنیں

خیرالامم کا منبع و مخرج عرب تھا جس نے نوع انسان کی تاریخ میں ایک نئے مہتم بالشان باب کا اضافہ کیا۔ آج بھی ایشیا اور افریقہ کے کتنے ہی ممالک عربوں کے زیرِ نگیں ہیں۔ ان کی میدانِ حیات میں تگ و تاز ختم نہیں ہوئی۔ انھی نے دنیا کو خالص جمہوریت کا صاف ستھرا نمونہ پیش کیا اور ملوکیت اور امتیاز نسل کا قلع قمع کر دیا۔ ان کی بدولت ایک نئی دنیا وجود میں آئی اور علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا۔ یورپ نے ان کے علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور ان سے استفادہ کر کے تحریک اصلاح اور نشاۃ الثانیہ سے روشناس ہوا جو اپنے عقب میں موجودہ ہرجہتی ارتقا لایا۔ خواہ مغرب اس کا معترف ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ جدید مغرب اپنے ظہور کے لیے اسلام ہی کا ممنونِ احسان ہے۔

قدرتی طور پر اقبال کا خصوصی پیغام عربوں ہی کے نام ہے جو اپنے تاریخی کردار کا پھر اعادہ کر سکتے ہیں۔ عرب کا المیہ یہ ہے کہ اس نے قیصریت کے استخواں کو چکنا چور کر دیا اور پھر خود ہی ملوکیت کا شکار ہو گیا۔ اہلِ فرنگ کی فریب کاری سے حکومتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر کے امت کو اس طرح پارہ پارہ کر دیا کہ وہ کئی قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ مغربی طاقتوں کی عیاری و فریب کاری کا سلسلہ برابر جاری ہے اس لیے اقبال نے اسے اغیار بد اندیش کے عزائم سے خبردار کیا ہے اور اسے پھر دین کی حبل متین کو محکم پکڑ لینے کی ہدایت کی ہے۔ یہاں بھی پیغام اپنی خودی پہچان ہی کا پیغام ہے۔ عرب قوموں کے سامنے سب سے بڑا

کام یہ ہے کہ مغرب نے علم و حکمت کو جس مسخ شدہ صورت میں فروغ دیا ہے ، اس کی اصلاح و تطہیر کریں اور جس طرح بیت اللہ سے اصنام کو بدر کیا تھا اسی طرح علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کے بگڑے ہوئے اصنام کو یورپ کے بتکدے سے نکال باہر کریں۔

اس طویل سفر کے بعد ہم آخر اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں اقبال کا روئے سخن تمام اقوامِ مشرق کی طرف ہے اور وہ انہیں بھالات موجودہ حقیقت پسندانہ مشورہ دیتے ہیں ۔ وہ یورپ کے متعلق کچھ نہیں کہتے ۔ ان کی رائے میں تو وہ ختم ہو بھی چکا ۔ سمجھ لیجیے اس کی تہذیب اپنے خنجر سے خودکشی کر بھی چکی ۔ سوال اقوامِ مشرق کے اپنے عروج کا ہے ۔ وہ کیسے حاصل ہو ؟ اس کے متعلق اقبال کو پورا پورا یقین ہے اور وہ ملہمانہ انداز میں کہتے ہیں :

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اسی بلوہ مشاہدہ کی بنا پر وہ پکار اٹھتے ہیں کہ دیکھو : مشرق کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑ گیا ۔ اس کے عروج کا زمانہ شروع ہو گیا ۔ اس کے سینے میں انقلاب ہی انقلاب کروٹیں لے رہے ہیں ۔ رات گزری دن ابھر آیا ۔

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلنے ہوئے سورج کی شفق تابی ہے

اشتہکار کی طرح وہ بھی سمجھتے ہیں کہ مغرب اپنی ہی تلوار سے گھائل ہو چکا ہے ۔ اس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے دنیا میں

لادینی کو فروغ دیا ۔ اقبال انسان کو کسی طرح محض پیکر آب و گل تصور نہیں کرتے اور نہ روح و مادہ کی دوئی کو تسلیم کرتے ہیں ۔ مشرق حق کا سرچشمۂ دیرینہ ہے اور وہ پھر اسی کا علمبردار بن کر میدان میں نکلے گا ۔

اٹھی پھر ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہ اطلس قبایان تتاری ہے

اقبال کی امیدیں مشرق ہی سے وابستہ ہیں ۔ اس لیے ان کا پیغام یہ ہے کہ اے اہل مشرق اٹھو ۔ لادینی کا خاتمہ کر دو ۔ عقل و علم کو عشق سے ہمکنار کر دو ۔ ان کی نار نور سے ہم آغوش ہو کر جہان تاب ہو ۔ انجمن اقوام اور اقوام متحدہ سے بہتری کی توقع بے سود ہے ۔ اہل یورپ کی مجلس کیا ہے مجلس سالوساں ہے ۔ جنیوا مکر و فن کے بغیر کیا جانے ۔ اس لیے اس کے فریب میں مت آؤ ۔

یہاں تاریخ پھر سوال اٹھاتی ہے کہ مشرق کے بارے میں اقبال کی خوش فہمی کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے ۔ کیا یہ حسن ظن کا کرشمہ تو نہیں ؟ کیا ایشیا واقعی محبتوں کی سرزمین رہا ہے ؟ کیا آفتاب و قمی تمام تر ہمارا ہے اور ہم آفتاب ہی سے ہیں ؟ کیا روحانیت واقعی اسم بامسمٰی ہے یا اس کی تہہ میں بھی کچھ اور پائے کوب ہے ؟ کیا مشرق میں ملوکیت کا دور دورہ نہیں رہا ہے ۔ یہاں کی اموی ، عباسی ، مغلیہ حکومتیں کہاں تک جمہوری و اسلامی تھیں ؟ کیا سیاست کا کھیل تا دم تحریر یہاں کبھی نہیں کھیلا جاتا رہا ؟ کیا چتینیا مشرق میں میکاولی کا روپ نہیں ؟ چنگیز خاں ، ہلاکو ، تیمور اور نادر شاہ نے کس جذبۂ محبت یا روحانی آدرشو

کے تحت مشرق و مغرب پر یلغاروں پر یلغاریں کیں اور جا بجا کھوپڑیوں کے مینار چنے ؟ مورخین کی رائے میں ان کی اجاڑی ہوئی سرزمینیں آج تک آباد اور شاداب نہیں ہوئیں ۔ ایسے امور پر بڑی ہی فراخدلی اور وسیع النظری سے بحث کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے دعووں کی بنیاد کھوکھلی نہ ہو ۔ اگر اہل مغرب ایسے سوالات اٹھائیں تو وہ حق بجانب ہوں گے اور ایسے سوالات اٹھائے گئے ہیں ۔ ان کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کی نفسیات بھی اس کے ماضی و حال سے وارستہ نہیں ہوتی ۔ وہ لامحالہ اپنے ماحول ہی کے ضمن میں سوچتا ہے ۔ اقبال نے بعض تاثرات کی بنا پر مشرق کے بارے میں ایک مستقل رائے قائم کر لی تھی ۔ مغرب کی استعماریت اس کے بر خلاف تھی ۔ کم از کم اس کی ضرب مشرق پر پڑتی تھی ۔ اس لیے وہ اس کے بارے میں حساس تھے ۔ پاپائیت مغرب میں اسلامی خلافت ہی کے بمنزلہ تھی ۔ اس نے لردانِ فرنگی کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو کر وطنیت ، قومیت ، تعقل پرستی ، مادیت اور لادینی کو فروغ دیا ۔ یہ ایک ایسا وطیرہ تھا جس سے دنیا بھر میں فتنہ و فساد کی آگ پھیل گئی ۔ مشرق تمام تر نہ سہی معتدبہ حد تک انسانی اقدار کا حامل رہا ہے ۔ اس لیے جب یورپ کا میل آہستہ آہستہ نیچے بیٹھنے لگے گا تو مشرق پھر اپنی بلند تر تہذیب و تمدن کے ساتھ اس پر چھا جائے گا ۔ گوتم ، زرتشت اور حضرت عیسیٰ کی ارواح جلیلہ کہیں پوشیدہ نہیں رہیں گی ۔ وہ تاریخ انسانی کے دوران میں بر بر کارفرما رہی ہیں اور ایک بار پھر دنیا کے گوشے گوشے پر چھا جائیں گی ۔ یہ بھی عجب نہیں کہ یہاں اور دیدہ ور پیدا ہوں اور ارتقا کا مرکز

نقل ، جیسا کہ اکثر ہوتا آیا ہے ، مغرب سے مشرق کی طرف منتقل ہو جائے - ہیروشیما اور ناگاساکی نے اور بھی ثابت کر دیا ہے کہ مغرب کی شتر بے مہار سائنس کی ترقی کس قدر خطرناک ہے اور خود یورپ کے بعض ائمۂ فکر نے علم و عقل کی شرانگیزی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اور ایسے یرمیاہ موجود ہیں جنھوں نے مغرب کے متعلق یاس آمیز خیالات کا اظہار کیا ہے -

اقبال نہیں چاہتے کہ مشرقی قومیں مغرب کے نقشِ قدم پر چلیں - وہ نہیں چاہتے کہ مشرق دوسرا مغرب ثابت ہو - وہ نہیں چاہتے کہ مشرق کی خودی مغرب کی خودی سے آمیز ہوکر مخلوط خودی ہو جائے - مگر وہ تو ہو بھی چکی اور خود اقبال اس کا نمایاں مظہر ہیں ان کا شخص ، ان کا کلام مغرب کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے - انھیں اعتراف ہے کہ مغربی اثر کے تحت انھوں نے ایک مخصوص انداز فکر پیدا کیا ہے جس کی چھاپ ان کے تصور اسلام میں بھی جھلکتی ہے - اس ناگزیر قبول اثر کے باوجود اقبال کی تمنا ہے کہ مشرق اپنی ایک وضع اختیار رکھے - مشرقی قومیں کسی اعتبار سے بھی مغرب کی دست نگر ہوں اور ان کے اپنے فکری روحانی قومیں مفلوج ہوکر رہ جائیں - مصنوعات ، ایجادات اور مشینوں میں مغرب کی دریوزہ گری غلامانہ ذہنیت کو استوار تر کر دے گی - مشرق کو لازم ہے کہ وہ خود تحقیق اور جدت طرازی سے کام لے - مصنوعات ، آلات ، دریافتیں اس کی اپنی ہوں - وہ زور نفس سے اپنی دنیا خود پیدا کرے -

آنچہ ازست از خاک تو اے مرد حر
آں فروش و آں بپوش و آں بخور

یہ بجا ہے لیکن واقعات کا دھارا جس طرح بہہ رہا ہے اور عام مشینیں تو چھوڑیے ، اہل مغرب کی صناعانہ مہارت نے جو بے پناہ ایجادات طیاروں ، کمپیوٹروں ، لاسلکی مواصلات ، دور مار برق ہتھیاروں وغیرہ کی شکل میں دھڑا دھڑ میدان میں لا ڈالی ہیں ، ان سے کافی عرصہ مشرق کو مغرب کا دست نگر رہنا ہی پڑے گا ۔ ہاں تیل کا ہتھیار اب بھی عرب کے پاس ہے ۔ اگر یہ پوری طرح کام آ سکے مگر یہ بھی تو ہتھیار کے مقابلے میں ہتھیار اور حربی سیاسی چالوں کے مقابلے میں حربی سیاسی چال ہوگا ۔ خبر نہیں حالات کب جا کر متوازن شکل اختیار کریں ۔ فی الحال تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس نظم کا خاتمہ وہی ہو سکتا تھا جس کا آخری عنوان مظہر ہے ۔ شاعر کو آخر حضور رسالتمآب میں عرض پرداز ہونا ہی پڑا ۔ وہ خود مرض میں مبتلا اور ان کی امیدوں کی سر زمین مشرق بھی سرد بیمار ۔ اس لیے دونوں آنحضرت ہی کی طرف رجوع ہو سکتے تھے ۔ جن کی رحمۃ للعالمینی اقوام عالم کے امراض کی چارہ گر ہے ۔ وہ ان کے سامنے عرب و عجم کا نقشہ کھینچ کر دکھاتے ہیں ۔ اور کس حسرت سے کہتے ہیں :

در عجم گـ دیدم و ہم در عرب
مصطفٰی نایاب و ارزاں بو لہب

انہیں افسوس ہے کہ مسلماں جنھوں نے تمام دنیا کو اپنے فیضان سے مالا مال کیا تھا ، اب بے دست و پا اور مغربی طور و طریق کا شکار ہیں - وہ اپنے ماضی ، اپنے دین آبائی ، اپنی شاندار روایات کو بھول گئے ہیں - ان کے دل و دماغ پر مغرب کا کابوس سوار ہے - انھوں نے بت خانۂ فرنگ سے طرح طرح کے لات و منات خرید لیے ہیں - جن کی نوعیت اور گوناگونی کی کوئی انتہا نہیں - محض ان کی قسمیں کیسے گنوائی جائیں - اقبال کو بارگاہ نبوی سے یہی امید ہے کہ کم از کم اس فرزندِ مشرق ، اس حدی خوان اسلام ہی کو ایسی آتش نوائی عطا کرے جو اہل مشرق کے سینوں میں ایک نئی لگن ، ایک نئی امنگ پیدا کر دے - اور وہ بھی اپنے گوناگوں امراض سے شفایاب ہو کر آفاق میں ایک صحت مند دینِ فطرت کے صحت بخش افکار اور اصول و آئین پھیلا دیں - یہ صرف میرے مغرب کی ذات فیض آثار ہی سے ممکن ہے :

خود بدانی قدر تن از جاں بود
قدر جاں از پرتو جاناں بود
یا ز غیراللہ نہ دارم ہیچ امید
یا مرا شمشیر گـردان یا کلہ

شاعر محسوس کرتا ہے کہ اس کی تنہا آواز کاروان مشرق کے لیے بانگِ درا ہے - اک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک . اس نکتہ و

تنہا نوا پرداز سے یہی ممکن ہے کہ بارگاہِ مرتضوی سے الہام پذیر ہو کر اپنا پیغام چار دانگ عالم میں پھیلا دے ۔ کچھ عجب نہیں کوئی ایسی حساس جماعت پیدا ہو جائے جو اس کے والہانہ پیغام کے شور و مستی کو اپنے اندر جذب کر کے سراپا طوفان ہو جائے اور اقضائے عالم میں تہلکہ برپا کر دے ۔

یہ ایک خواب ہے ، ایک شوریدہ نوا ، روح انقلاب سے سرشار شاعر کا خواب -- جس کو وہ دوسروں کے لیے چھوڑ گیا ہے تا کہ یہ ان سب کا خواب بن جائے اور وہ عالمِ غیب میں پوشیدہ رعنائیوں کے تصور سے ہمکنار ہوں ۔

دوسری نظم ''مسافر'' نسبتہً مختصر ہے ۔ کل ۳۱۲ اشعار ۔ یہ افغانستان کے اس سفر کی یادگار ہے ۔ جو اقبال نے نادرشاہ کی دعوت پر اختیار کیا ۔ لیکن اس کا انداز جغرافیائی سفر سے بہت مختلف ہے ۔ زمین وہی مثنوی کی لیکن متفرق نظموں سے آراستہ جیسے یہ ایک نظر فریب مرقع ہو ۔ بوقلموں اجزا کے حسن ترتیب نے اسے خاصا متنوع بنا دیا ہے ۔ ''جاوید نامہ'' کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جس کا یہ علیحدہ 'فنک' معلوم ہوتا ہے یا اس کا پیش آہنگ ، اس کی دلچسپی اور وضع قطع اقبال کی تمام تصنیفات سے مختلف ہے ۔ منفرد تکنیک اور افغانستان سے متعلق مشاہدات اور تاثرات نے اسے مرکب وضع عطا کر دی ہے ۔ گویا یہ بھی ''الفاروق'' کی طرح ''مرصع غزل'' ہو یا نقش ہائے رنگ رنگ پر مشتمل کولیج (Collage) ۔ افکار تو ظاہر ہے اقبال کے وہی جانے پہچانے افکار ہیں جن کی ترجمانی وہ پیرائے بدل بدل کر اپنی تصنیفات میں کرتے رہتے ہیں لیکن پیشکش میں وہ

نرالا پن ہے جس نے "جاوید نامہ" میں زیادہ وسیع پیمانے پر رونما ہو کر اسے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ دونوں سفر ہیں، ایک حقیقی دوسرا خیالی، ایک زمینی دوسرا آسمانی۔ لیکن اس سے پیشکش کی نوعیت میں زیادہ فرق نہیں پڑا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ تخیل میں زیادہ لوچ لچک کی گنجائش ہے۔ مشہور ہے گلا بادشاہ کیونکہ اس کے لیے آواز کے اتار چڑھاؤ اور لوٹ پھیر میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہی کیفیت خیال کی ہے۔ متخیلہ کو کوئی امر مانع نہیں کہ وہ کسی وقت جو بھی رنگ چاہے اختیار کر لے۔ مثلاً حقیقی مشاہدہ کی صورت میں شرف النساء کا مقبرہ سیدھا سادا مقبرہ ہے اور بس۔ اس میں کوئی کمی بیشی ممکن نہیں۔ سنگ و خشت کی معمولی عمارت۔ لیکن اقبال نے خلدِ بریں میں اس کے روضے کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ایک محیر العقول تصور ابھرتا ہے جو تخیل کی حدوں کے ساتھ پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ اسی طرح سروش اور ربابِ کائنات کے مرقعے نادر ترین مرقعے ہیں جو صرف تصویر خیالی ہی میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حقیقی مشاہدہ میں اس کی بہت کم گنجائش ہے۔ ہاں اگر مواقع یا مناظر ایک جیسے ہوں تو پھر حقیقی اور خیالی مرقعوں میں چنداں فرق محسوس نہیں ہوتا اور "مسافر" میں ایسی ہی ندرتیں جمع ہو گئی ہیں جن سے حقیقت کا دامن خیال سے جا ملا ہے۔

اسلام کی طرح دنیائے اسلام کا ہر ہر گوشہ بھی اقبال کے دل میں سمایا ہوا تھا اور عرب و عجم کی طرح افغانستان کی لگن بھی ان کے دل کو تڑپاتی تھی۔ افغانستان سے انس کچھ اس لیے بھی تھا کہ یہ قریبی ہمسایہ ملک تھا جس کی ہندوستان کے ساتھ دیوار سے دیوار

ملتی تھی - جس کی تاریخ کا دامن برِصغیر کی تاریخ سے اکثر ملتا رہا ہے اور یہاں کے جری باشندوں نے بارہا اپنے کوہساروں سے نکل نکل کر برِصغیر میں مضبوط ، شاندار سلطنتیں قائم کی تھیں - یہ محمود غزنوی ، محمد غوری ، احمد شاہ ابدالی کی سرزمین تھی جس سے یوں بھی بہت دوررس توقعات تھیں - زمین درۂ خیبر ہے محوِ انتظار اب بھی - کہ آ جائے کوئی رہوار وحشت پر سوار اب بھی - برِصغیر کے اقتدار باختہ محکوم فرنگ ہندی مسلمان کے لیے اس سے زیادہ خوش کن تصور اور کیا ہو سکتا تھا - حق کی نگاہیں بے بسی کے عالم میں کسی احمد شاہ ابدالی کی منتظر تھیں - بہرحال اقبال کو خوشحال خان خٹک جیسے جیالے مردِ کہسار کے قہستانی وطن سے کتنی ہی مناسبتیں تھیں اور اس کے حالات ان کے لیے گہری دلچسپی کا باعث تھے -

دیگر اسلامیانِ عرب و عجم کی طرح اقبال نے اہلِ افغانستان کو بھی جد و جہد کا پیغام دیا تھا : او غافل افغان - اپنی خودی پہچان - وہ خوشحال خان خٹک جیسے مشہور شاعر کی مبارزانہ روح کو اردو سے روشناس کرا چکے تھے بلکہ انگریزی میں بھی اس کے چیدہ فن پاروں کی جھلک پیش کر چکے تھے - ملا لولائی کا کلبانگ بھی اسی سلسلے کی ایک دلچسپ کڑی تھا - گویا ذہنی حیثیت سے اقبال پہلے ہی افغانستان کی سیاحت کر چکے تھے اور اس کے باغ و راغ کے تماشا کے لیے ہمہ تن شوق تھے -

اقبال کو یقین تھا کہ ذہین و فطین ، جری افغانوں میں ایسے جوہر ہیں جو تعلیم سے جلا پا کر چکاچوند پیدا کر سکتے ہیں اور پہلے کی طرح پھر زبردست کردار ادا کرنے کے اہل ہیں - نظم ہی نہیں

نثر میں بھی اقبال نے بارہا افغانانِ غیور و دلیر کو جی کھول کر داد دی ہے ۔ افغانستان کی جغرافیائی حیثیت ہی مرکزی نہیں جو چاروں طرف روس ، ایران ، چین اور برِصغیر پاک و ہند سے مماس ہے ۔ وہ جرأت و بسالت میں بھی فرد ہے ۔ ایشیا کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ۔ اگر دل تندرست ہے تو جسم بھی بشاش ہوگا ۔ دل بے کار ہے تو سب کچھ بے کار ۔ افغانستان سے متعلق ایک تصنیف کے دیباچے میں اقبال نے افغانستان کے تابناک ماضی کا ذکر کیا ہے ۔ جو حال اور مستقبل کے بارے میں سہانے تصورات کی نشاندہی کرتا ہے ۔ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں افغانستان سے گہری دلچسپی تھی ۔

جس قوم نے محمود غزنوی ، علاءالدین خلجی ، شیر شاہ سوری ، احمد شاہ ابدالی ، امیر عبدالرحمٰن خان ، نادر شاہ اور جمال الدین افغانی جیسی جلیل القدر ہستیاں پیدا کی ہوں جن سے تاریخ کا افق مدت سے تابناک اور درخشاں ہے ، وہ بلاشبہ سرزمینِ ایشیا میں نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے اور اس کی تاریخ پر تحقیق اور غور و خوض کی اشد ضرورت ہے ۔ یہی احساسات اور 'دل آسیا' سے بلند توقعات ہیں جن کی بنا پر ''پیامِ مشرق'' میں (۱۹۳۲) کو امیر امان اللہ خان سے منسوب کیا گیا ۔ اقبال کے دل میں افغانستان کی زیرک ، روئیں تن اور روشن جبیں قوم کا بے حد احساس ہے اور وہ اس کے کوکبِ تقدیر کو فروزاں دیکھنا چاہتے ہیں ۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ بیٹھے بٹھائے بچا سقا جیسے شوریدہ بخت ، حقیر انسان کو خاک سے اٹھا کر تختِ شاہی پر بٹھا

دیا ۔ اس سے اقبال کو اپنے ہم وطنوں کی طرح سخت رنج ہوا ۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتے تھے ۔ اس نازک موقع پر نادر شاہ نے بڑی ہمت اور اولوالعزمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے محبوب وطن کو نجات دلانے کا تہیہ کیا ۔ اس کا راستہ ہندوستان ہی سے پڑتا تھا ۔ اقبال افغانستان کے نازک حالات پر اس قدر فکرمند تھے کہ وہ نادر شاہ سے ملنے ریلوے اسٹیشن پر گئے ۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ پھر اقبال نے بھمہ اشتیاق نادر خان کو الگ لے جا کر اپنی عمر بھر کی جمع پونجی دس ہزار روپے پیش کی تا کہ اس مہم میں کام آ سکے ۔ نادر شاہ نے نہ مانا لیکن جب اقبال نے اصرار کیا تو یہ طے پایا کہ ضرورت پیش آئی تو وہ یہ رقم منگوا لے گا ۔ خیر ، عطیے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی ۔ نادر شاہ اپنے بھائی بندوں ہی کی مدد سے کامیاب ہوا اور ملک میں امن و امان قائم کر کے اس کی معاشی خوشحالی اور رفاہ و بہبود کے لیے متعدد اصلاحات جاری کیں جن میں تعلیم بھی شامل تھی ۔ اس کے لیے ہندوستان کے ماہرانِ تعلیم کو دعوت دی گئی اور ان کا ایک وفد جو اقبال ، سر راس مسعود اور مولانا سلیمان ندوی پر مشتمل تھا ، افغانستان تشریف لے گیا ۔

اقبال تہہِ دل سے نادر شاہ کے مداح تھے اور اس کی ذات میں نہ صرف افغانستان بلکہ دنیائے اسلام کا ایک تابناک ستارہ دیکھ رہے تھے ۔ اس سے ملاقات ، مسائل پر گفتگو اور افغانستان کی سیر و سیاحت کے بعد ان کے دل پر خیالات و تاثرات کے جو نقوش مرتسم ہوئے ان کا دلآویز دستاویزی مرقع ''مسافر'' ہے ۔

اقبال کی نظر میں نادر شاہ اسلامی روح اور سطوت و جلال کا

مظہر تھا ۔ وہ محض شاہ نہیں بلکہ بندۂ مومن تھا ۔ اس کی ذات میں اسلام کی مثالی ہستیوں کی طرح امیری و فقیری مجتمع تھیں ۔ وہ حافظ دین مبیں تھا ۔ اقبال کی نظر اس کے عہد میں عہد صدیق کا جلال اور عہد فاروق کا جلال مشاہدہ کرتی تھی ۔ بادشاہی اس کی شمشیر اور درویشی نگاہ تھی ۔ بالفاظِ دیگر اس میں مصطفیٰ کی ذاتِ والا صفات کا عکس نظر آتا تھا ۔ قدرتی طور پر اس نغمۂ شوق کی ابجد نادرِ شاہ ہی کا ذکرِ خیر ہے جس نے شاعر کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا اور وہ بصد شوق پُر پیچ و خم راستے طے کرتے ہوئے اس کے حضور پہنچے تھے ۔ نظم شاہ شہید کے سانحۂ شہادت کے بعد تحریر ہوئی ۔ اس لیے شاعر نے اسے بڑے پُر سوز اور محبت بھرے لہجے میں یاد کیا ہے :

اے صبا اے رہ نورد تیزگام در طوافِ مرقدش نرمک خرام
شاہ در خواب است با آہستہ نہ غنچہ را آہستہ تر بکشا گرہ

دعوت کے رسمی بلاوے میں شوخیٔ فکر نے عجب رنگ بھر دیا ہے جو افغانستان کی کوہستانی نوعیت کے عین مطابق ہے :

اے باغوش سحاب ما چو بـرق
روشن و تابندہ از نور تـو شرق
یک زماں در کوہسار ما درخش
عشق را باز آں تب و تابے بہ بخش

ملک کی سنگینی بجا لیکن یہی اس کے زجاج کے حق میں سنگ ثابت ہوا ہے :

ریز ریز از سنگ او مینائے او   آہ از امروز بے فردائے او

اقبال کا پیغام افغانستان اور سرحد کی حریت پسند اقوام کو اہلِ اسلام کا حیات افروز پیغام ہے ۔ جسے افغانوں کی فطرت کے ساتھ قدرتی مناسبت ہے ۔ خودی ـــ اسلام ، ایمان ، دل کی پروردہ خودی جسے تعمیری مقاصد پر صرف کیا جائے ، یہی ملتِ افغانیہ کے نشو و نما کی صحیح نہج اور یہی اس کے فردا ، اس کی تقدیر کی صورت گر ہے ۔

سیاحت میں قدرتی طور پر کابل پیش پیش ہے ۔ ایک اور فردوس بر روئے زمیں ۔ ظاہری نگاہ تو اس حسن زار کے قدرتی کرشمہ ہائے سحر کار ہی کو دیکھتی ہے ۔ کتنی نظر فریب تصویر ہے :

در ظلامِ شب سمن زارش نگو
بر بساطِ سبزہ می غلطد سحرا
آں دیار خوش سواد آں پاک بوم
بادِ او خوشتر ز بادِ شام و روم
آب او براق و خاکش تابناک
زندہ از موجِ نسیمش مردہ خاک

لیکن شاعر ایک سرشار ذوق ناظر کی حیثیت سے اس کو حدیثِ دیگراں کی روشنی میں بھی دیکھتا ہے کیونکہ اس کی طبیعت میں ہر طرح کے نقوش جمع ہیں :

چشمِ صائب از سوادش سرمہ چیں

اب جاوید نامہ کا انداز اور آگے بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ انداز نظر بھی ۔ بابر کا مزار تاریخ کے کتنے ہی خزانے اپنے اندر لیے ہوئے ہے ۔ خلد آشیانی فاتح ہند کی شخصیت گوناگوں حالات و واردات کی طرف عنان کش ہو کر قدرتی طور پر غزل کی شکل اختیار کرتی ہے ۔ حریت ، حرم کے ساتھ رابطۂ استوار اور مرد مومن کے لیے ہتھیاروں کا ہتھیار ۔ نگاہ برندہ تر از پولاد ۔۔ یہی ہر ملت مسلمہ کے لیے وسیلۂ کامرانی ہے جسے اقبال نے اشاروں ہی اشاروں میں واضح کر دیا ہے ۔

سلاطین کے ساتھ ہی ساتھ اہل دین بھی ہیں ۔ وہ اہل بصیرت جنھیں حق نے بخشا ہے ذوق خدائی ۔ غزنی ۔۔ 'حرم علم و فن' اور مرغزار شیر مردان کہن' ۔۔ کا آسودۂ خاک حکیم ابوالمجد مجد بن سنائی اسلامی روح کا بلیغ ترجمان ہے ۔ اقبال کی نظر میں سنائی اور وہ خود ایک ہی منزل کے رہ پیما ہیں ۔ جہاں سنائی ایمان کی ماہیت واضح کرتا ہے وہاں اقبال یہ بتاتے ہیں کہ بندۂ مومن کے اوصاف کیا ہیں ۔ جاوید نامہ ہی کی طرح وہ حکیم سنائی کی روح جلیل سے ملت کے پردۂ غیب میں مستور احوال کے بارے میں استفسار کیے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ سنائی کا جواب مفسر ایمان کے عین مطابق ہے اور وہ تمام تر عشق کی حرارت دروں کی داستان ہے ۔ غزنوی صنم شکن سلطان محمود کے ساتھ اسلام کی سطوت دیرینہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ جس کا آئینہ اس کا پایۂ تخت تھا ۔ اس کی ویرانی دل میں ہوک پیدا کرتی ہے ۔ اس کا شکوہ و فال و فر افسانہ بن کر رہ گئے ہیں جس سے بے اختیار لبوں پر آہ آتی ہے ۔ شہر غزنیں کی بہشت رنگ و بو کی

سیر کرتے کرتے بعینہ جاوید نامہ کی طرح ڈرامائی کایا پلٹ ہوتی ہے۔

نکتہ سنج طوس را دیدم بہ بزم لشکرِ محمود را دیدم بہ رزم

اس طرح عالم خیال میں شاعر کی روح عالم غیب میں پہنچ جاتی ہے:

روح سیر عالم اسرار کرد تا مرا شوریدۂ بیدار کرد

یہ درحقیقت شاعر کے دل کی آواز ہے جس نے کلام کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سخنہائے گفتنی کے لیے ایک انوکھی ترکیب:

آں ہمہ مشتاق و سوز و سرور
در سخن چوں رند بے پروا صبور
تخم اشکے اندراں ویرانہ کاشت
گفتگو تا با خدائے خویش داشت
تا نبودم بے خبر از راز او
سوختم از گرمیٔ آواز او۔

اس طرح مردِ شوریدہ کے فرضی نکتہ سنج کے روپ میں اقبال کنایۃً خدا کے حضور اپنی استدعا کرتے ہیں:

شرق را کن از وجودش استوار صبح فردا از گریبانش برآر!

قندھار جو اب ازبکستان میں زرقشاں کے نام سے موسوم ہے، کی کشش ایک طرح دیارِ حبیب مدینہ کی سی کشش ہے۔ کیونکہ اس میں خرقۂ مبارک کی زیارت انسان کو موکشاں لے جاتی ہے۔ اسی کی بدولت قندھار کی خاک اہلِ دل کے لیے خاکِ مراد ہے۔ شاعر کے بے تاب احساسات ایک لطیف غزل کے مستانہ اشعار میں

ڈھل جاتے ہیں ۔ آخری شعر سراسر والہانہ ہے ۔ کیونکہ یہاں دیدہ و دل ہی نہیں جسم کا ذرہ ذرہ خرقۂ مبارک کی زیارت سے تماشا مست ہو جاتا ہے ۔

غزل کی زمین خصوصیت سے بدیع ہے ۔ صہبا مست ، دریا مست ، بڑھتے بڑھتے تماشا مست ہو جاتے ہیں اور بات الاپ سے ٹیپ تک مستی ہی مستی بن جاتی ہے ۔

شاعر کی علمی گہرائی اور گیرائی یہاں بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی ۔ اس نادر موقع پر اسے قرآن و حدیث کے حسبِ حال الفاظ فراموش نہیں ہوتے ۔ یہ پھر اقبال کے بھرپور ثقافتی رچاؤ کی خبر دیتے ہیں ۔ برزخ لایبغیان ، خرقتان ، اسرا ۔ خرقہ کی زیارت سے دل پر جو مستانہ کیفیت طاری ہوتی ہے وہ دیدنی بھی ہے اور شنیدنی بھی ۔ وجدانی احساس کا نہایت بدیع اظہار :

ہادلِ من شوقِ بے پروا چہ کرد !
بادۂ پرزور با مینا چہ کرد !
رقصد اندر سینہ از زورِ جنوں
تا ز راہِ دیدہ می آید بروں !
گفت 'من جبریلم و نورِ مبیں'
پیش ازیں او را ندیدم ایں چنیں !
شعر رومی خواند و خندید و گریست
یا رب ایں دیوانۂ فرزانہ کیست !

در حرم با من سخن رندانہ گفت
از مے و مُغ زادہ و پیمانہ گفت!
گفتمش ایں حرفِ بیباکانہ چیست
لب فرو بند ایں مقامِ خامشی است
من ز خونِ خویش پروردم ترا
صاحبِ آہِ سحر کردم ترا
بازیاب ایں نکتہ را اے نکتہ رس
عشقِ مرداں ضبطِ احوال است و بس
گفت عقل و ہوش آزارِ دل است!
مستی و وارفتگی کارِ دل است!
نعرہ ہا زد تا فتاد اندر سجود
شعلۂ آوازِ او بود، او نبود!

دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے - اس الہامی حالت میں وہ بعینہ جبریل اور نورِ مبیں معلوم ہوتا ہے - فرطِ شادی سے جو جنوں نما کیفیت طاری ہوتی ہے اس میں خندۂ بے اختیار بھی ہے اور گریۂ بے اختیار بھی - دیوانگی اور فرزانگی دونوں یکجا - شاعر دل کو تنبیہ کرتا ہے کہ اس قدر از خود رفتہ ہونا مناسب نہیں، لیکن وہ بھلا ضبط کے آداب کیا جانے - دل کی بات دل کی ہے - وہ عقل و ہوش کی قید و بند سے آزاد ہے - اس لیے عالمِ مستی و وارفتگی میں جو اس کی مخصوص کیفیت ہے، وہ بے اختیار نعرہ بلند کرتا ہے اور پھر - شعلۂ آواز او بود او نبود! - آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ

جو تنہا جل گیا'

یہاں مشاہدہ کی حدیں تخیل تک جا پہنچتی ہیں اور ساتھ ہی رمزیت بیان بھی - بعینہ ویسی ہی ڈرامائی مکھم سی افتاد جیسی جاوید نامہ کے خاتمہ پر قاری کو اچنبھے میں مبہوت چھوڑ جاتی ہے اور اس پر ایک گم سم سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے - اس قسم کا نکتہ آمیز اساطیری سا ماجرا جس میں کوئی پُر لطف بات مزے لے لے کر کیف آفریں پیرائے میں بیان کی گئی ہو ، اقبال کا بدیعۂ خاص ہے جس کی جھلکیاں بار بار دکھائی دیتی ہیں - جیسے جواب شکوہ - شبنم - حقیقت حسن - محبت وغیرہ میں - خود "پس چہ باید" میں بھی شبنم ہی کی ایک اور مثال ہے :

قطرۂ شبنم کہ ز ذوقِ نمود　　عقدۂ خود را بدستِ خود کشود
اندر آغوشِ سحر یکدم تپید　　تا بکام غنچۂ نورس چکید

یہ ایک طرح کا افسانچہ ہے بلکہ اس کا بھی ملخص یا مکرر کشید جو اس میں دہرا کیف پیدا کرتی ہے - اس سے ذہن میں از خود دل کا وہ خیالی نقشہ ابھر جاتا ہے جو غالب نے "ابر گہر بار" میں نعت کے سلسلے میں پیش کیا ہے - ضمناً اچھوتے واقعات اور نوادر جیسے خرقہ ، ترکِ جوش وغیرہ سے اقبال کی وسیع دلچسپیوں کے ساتھ ان کی ہمہ گیر ذکاوت بھی نمایاں ہوتی اور ان کی مدنیت کو سیر حاصل بناتی ہے -

اس نظم میں بھی ٹیپ کا بند جاوید نامہ کی طرح صلاح مشورے اور بزرگانہ تلقین پر مشتمل ہے - جاوید نامہ میں جاوید اور نژاد نو

سے خطاب تھا تو یہاں سلطانِ شہید کے فرزند ظاہر شاہ سے مخاطب ہے - شاعر خواہاں تھا کہ افغانستان کے سلسلے میں آخری بات مفید، سبق آموز ہدایات و اشارات پر مشتمل ہو - جمہوریت نے افغانستان جدید کی بنیاد رکھی وہ تو موجود نہیں لیکن اس کا جانشین ظاہر شاہ موجود ہے - اسرار ملک کی پردہ کشائی اسی پر مناسب ہے تاکہ سلطنت استوار سے استوار تر ہو جائے - یہ مقصد عیاں تھا لیکن اس تک رسائی حکمتِ عملی ہی سے ممکن تھی - ملتِ افغانیہ کے بانی احمد شاہ بابا کے مزار پر حاضری نے اس کی طرف رہنمائی کی - یہاں بھی تاریخ کا مطالعہ دو عظیم فاتحین میں مشابہت ظاہر کرتا ہے - احمد شاہ کی روحِ پاک شاعر سے التماس کرتی ہے -

فاش گو با پور نادر فاش گوے باطنِ خود را بہ ظاہر فاش گوے

لہذا قرآن اور اسلام کے بصیرت افروز نکات و اسرار اقبال کی زبانی بھر ادا ہوتے ہیں - چونکہ اقبال کا سرچشمہ فیضان قرآن ہی قرآن ہے، اس لیے ان کے آخری الفاظ اس کا برملا اعلان ہیں اس طرح پردہ گرتا ہے اور ہم ان مشاہدات کو چشمِ تصور میں پڑے دہراتے ہیں -

اس نیرنگِ تماشا میں شعر و فن کی کچھ کچھ جھلکیاں ہی دکھائی دے سکتی ہیں - اقبال کی طبیعت کی طرح ان کا کلام بھی جمال کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے - سبک ہندی نے ان کے یہاں خیال بندی کے طلسم زار سے نکل کر سبک عراقی کی تراش خراش اور شفاف کیفیت پیدا کر لی ہے - الجھاؤ کی بجائے سلجھی ہوئی لطافت

اور نفاست ہے - نوکیلی اپج کی بجائے نرم و گداز سڈول پن ہے - ایسے شستہ و رفتہ کلام پر مجلی کا اطلاق موزوں ہے - شروع شروع میں کچھ کچھ عجوبگی کی طرف میلان سلجھ کر ہموار ہو گیا ہے - یہاں تک کہ قرطاسِ ہوا ، نکہتِ اختر ، عقدۂ بتخانہ اور نرگسِ شبنم فریب جیسے گھنک ، بدیع ، مرصع نقوش کا شاذ و نادر ہی گمان گذرتا ہے اور ان میں اس قسم کی تجریدی کیفیت نظر نہیں آتی جو محض مشاہدۂ حق اور مجرد احساسات کی غماز ہو - طغیان کی بجائے 'یکے نرمک خرام' کی روش فکر و فن سے معتدل بہاؤ پیدا کرتی ہے - جلال اپنی بلندیوں سے اتر کر جمال کے ساتھ شیر و شکر ہو جاتا ہے - وہی عمل جسے جاوید نامہ میں یوں بیان کیا گیا ہے -

پیش ما صد پردہ ہا آویختند جلوہ ہائے آتشیں را بیختند
تا زہم سوزی شود دل سوز تر سازگار آید بشاخ و برگ و بر

یہی کلام میں ٹھہراؤ اور رنگ ایسی کیفیت ہے جو اقبال کو مرشد رومی سے ممیز کرتی ہے - رومی کے یہاں گمبھیرتا اور عذوبت کا رچاؤ محض اتفاقی اور سرسری ہے - اقبال سہانے تخیلات اور سہانے پیرایوں کے شاعر ہیں ۔ ان کی خصوصیت حسنِ ادا ہے - وہ پیکرِ الفاظ کو خوش آیند تراش خراش میں دیکھنے کے دلدادہ ہیں جیسے کوئی خوش ذوق خطاط عبارت میں بانکپن پیدا کرے اور اس کے پیچ و خم میں شانِ طرحداری نظر آئے - اگر ان کے یہاں کیف نہ ہوتا تو نہ نکتہ آفرینی نہ وعظ و تلقین کی پردہ پوشی ممکن ہوتی - جو کیف و رنگ کا پردہ سرکنے پر کلام کی تہہ سے نمایاں ہوتی ہے - اس طرح فن کی اٹھان ایک خاص سطح پر قائم رہتی ہے - کلامِ اقبال کے

تیور یکساں ہیں ۔ خواہ مثنوی ہو یا غزل یا کوئی اور صنف ۔ تخیل ، رعنائی ، ٹھہراؤ ، باوقار لب و لہجہ ، احساس و تخیل میں تعدیل ، بلند آہنگ سرمدی کیفیت اور لفظ و بیان میں توازن حسن کاری ۔ یہ تمام ایک نستعلیق اسلوب کے جوہر ہیں ۔ اس میں رومانویت کی ترنگ ہے بے تحاشا یا لاابالیانہ پن نہیں ۔

اقبال کی آواز میں ماضی و حال کے گنبدوں سے آتی ہوئی کتنی ہی آوازیں گونجتی ہیں ۔ وہ نہ صرف صوت حکایتی سی کیفیت پیدا کرتی ہیں بلکہ ان کے ذوقِ ہمہ بینی و ہمہ جوئی کی آئینہ دار بھی ہیں ۔ ایک ایسی شخصیت کی علامت جو مختلف رنگوں اور شعاعوں کو فراہم کر کے ان میں اپنے رنگ اور روشنیٔ طبع کی آمیزش سے مرکبوں کو مرکب تیار کرتی ہے ۔ کیا اسے شعری میناکاری یا منبت کاری کہا جائے ، جو نقشِ مرصع کی تشکیل کرتا ہے ۔ کہنگی را از تماشا امکنم (غالب) ، مال را گر بہر دیں باشی حمول (رومی) ، خوشا وقتے کہ چشمم از سوادش سرمہ چیں گردد (صائب) ، آں قدح بشکست و آں ساقی نماند (جامی) ، فصبحتم ، نظر ، لی خرقتان (قرآن) ، 'ترک جوش' (رومی) ، آنکہ چوں کودک ز کوثر لب بشست (فردوسی) ، در بیاباں مثل چوب نیم سوز (آتش) ، منبر شاں منبر کاک است و بس (مشاہدہ) ۔

اقبال کی مثنویات میں مثنوی معنوی کی بحر کی طرح بیان واقعہ کا عنصر بھی مشترک ہے ۔ یہاں تک کہ ان کے شاہکار جاوید نامہ میں بھی یہ خصوصیت نمایاں ہے ۔ ایک طرح کی وجہ جامع ۔ یہاں فکری عنصر سرسری ہے جسے الفاظ کی رعنائی سہارا دیتی ہے :

فقر خواہی از تہی دستی منال

امور واقعی کے مسلسل بہاؤ میں کہیں کہیں سوزِ دروں ، جوشِ جنوں ، شوخیٔ تخیل ، زورِ بیان یا جولانیٔ فکر کے باعث ایک ہاکی سی لہر اٹھتی ہے ۔ ہموار سطح پر ایک چمکدار سلوٹ ۔

خیمہ را از کہکشاں سازد طناب
زورق زرین تو در جوئے نور
ساختہ پرداختہ آراستہ
ساعد سیمین شاں عیش نظر

یہ بس ایسا ہی ہے جیسے چھوٹے چھوٹے سنگریزوں کو سنگِ پارس چھو جائے اور وہ ایک دم چمک کر کندن بن جائیں ۔ پس چہ باید میں زیادہ تر حسبِ حال امور ہی کا تذکرہ ہے جو اسرار و رموز سے مختلف نہیں ۔ اس لیے ایسے لمحات جن کا اثر بھرپور ہو کم کم ہیں ۔ حسنِ کلام کی حیثیت سے ان کی تاثیر کا راز صرف جذبہ و جوش کی والہیت میں ہی مضمر ہے ۔ تبھی کئی کئی لہروں کے جلترنگ بج اٹھتے ہیں ۔ جیسے وہ سیال سنکھ ہی سنکھ ہوں اور کبھی بہت سی لہروں کے جغرمٹ موج خیز ہوتے ہیں ۔ چونکہ ''مسافر'' میں موضوع کی ہرکار نوعیت کے باعث شاعری کے امکانات زیادہ وسیع اور ایجی لمحات فراواں ہیں اس لیے اس میں دونوں کیف آفریں صورتیں زیادہ نمایاں ہیں ۔

رخ نمود از سینہ ام آں آفتاب
پردگیہا از خروشش بے حجاب

مہر گردوں از طلوعش در رکوع
از شعاعش دوش می گردد طلوع
دا رہیدم از جہانِ چشم و گوش
فاش چوں امروز دیدم صبح دوش
شہر غزنیں ! یک بہشتِ رنگ و بو
آبجوہا نغمہ خواں در کاخ و کو
قصر ہائے او قطار اندر قطار
آسماں با قبہ ہایش ہمکنار

یعنی سلطان محمود کے مزار پر اس کے جاہ و جلال اور شان و شکوہ کی تصویر میری نگاہوں میں اتر آئی ۔ قندھار میں قدرتی حسن کو قدرتی روپ ہی میں اجاگر کیا گیا ہے :

رنگ ہا بو ہا ہوا ہا آب ہا آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا
لالہ ہا در خلوتِ کہسار ہا نارہا یخ بستہ اندر نارہا

پہلے مصرعے میں 'ہا' کا دونوں مصرعوں میں کتنی ہی بار لوٹ لوٹ کر آنا اور پھر پارے کی طرح پانی کی چمکار جوت اور سرسنگیت کے سہانے ملاپ سے بصری سمعی جادو جگاتی ہے ۔ یہ سلسلہ اگلے شعر کے مصرعوں میں بھی اسی طرح لہریا سماں پیدا کرتا ہے لیکن ساتھ ہی تخیل کا بھی روپ انوپ انوکھی دھنک لگاتا ہے ۔ پہلی بار 'نار ہا' میں انار کے بے شمار لال انگارہ دانوں کی طرف اشارہ ہے ، آگ ہی آگ ، اور دوسری بار یہ خود انار ہی انار ہیں ۔ قندھار کے بڑے بڑے انار جن کی باہر سے چھال بھی لال ہی لال ہے ۔ طرفہ تر

یہ کہ آگ تمام شعلہ زن آگ نہیں ، بلکہ انار کے سرخ سرخ دانوں کی جگہ جگہ جمی جمی آگ ہے ۔

ترجمہ ایک ایسی صنف ہے جس کے دو رخ ہیں ۔ ایک رخ مصنف کی طرف اور دوسرا مترجم کی طرف ۔ جس میں وہ بعینہ مصنف کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنی ذاتی خوبی اور حقیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے ۔ لہذا یہ رخ یا حصہ بمنزلہ' تصنیف ہے ، خالصتاً طبعزاد اور اس کا اسی حیثیت سے جائزہ لینا چاہیے ، لیکن عام طور پر اصل ہی کو اہمیت دی جاتی ہے اور ترجمہ کو بحیثیت تصنیف نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ حالانکہ اس تخلیقِ ثانی میں مصنف کی حیثیت خارجی ہوتی ہے ۔ اس کا سروکار تو صرف تخلیق اولی ہی سے ہوتا ہے ۔ عام خیال ہے کہ ترجمہ کے لیے صرف دونوں زبانوں پر قدرت درکار ہے ۔ تا کہ مفہوم کی کماحقہ' عکاسی کی جا سکے ۔ یہ خیال نہایت سطحی ہے کیونکہ اس میں مترجم کا رخ مدِ نظر نہیں رکھا جاتا ۔

ہر تصنیف گوناگوں عناصر سے مرکب ہوتی ہے اور مفہوم ان میں سے صرف ایک ہے ۔ اس کا صحیح اندازہ اس کی صلاحیتوں ہی کو ملحوظ رکھنے سے ممکن ہے ۔ جن میں علم و ادب ، ذوق و فن اور تخیل و تخلیق بھی شامل ہیں ۔ خالقِ ثانی کی حیثیت سے جولانی طبع کی حد تک وہ اس مقام کا مستحق ہے جو بحیثیت مترجم اس کی دسترس میں نہیں ۔ ان امور کے پیشِ نظر اصل اور ثانوی پیشکش میں امتیاز لازم ہے تا کہ دونوں کا کماحقہ اندازہ کیا جا سکے ۔

شاید چند مثالیں دونوں رخوں کو واضح کرنے میں مدد دیں :

بکشائے لب کہ قند فرانم آزروست
بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آزروست

ہونٹوں سے گھول رس مزہ ساماں کہیں جسے
چہرہ دکھا کہ رشک گلستاں کہیں جسے

نگاہ فن بہ تماشائے آسماں بود است
بہ دوش ماہ و بہ آغوشِ کہکشاں بود است

میری نگاہوں نے دیکھا ہے پھیلے نیلمبر کا سماں
کبھی بہ ہالۂ ماہ نشیمن کبھی بہ شاخ کابکشاں

ان سب میں نقش اول اور تخلیق ثانی میں بین فرق ہے جو 'آسماں' اور 'پھیلے نیلمبر' سے ظاہر ہے اور یہ فرق ترجمہ کے تصور ہی سے رونما ہوا ہے ۔

پیشِ نظر تراجم میں یہی تخلیقی نقطہ اختیار کیا گیا ہے ۔ جو مجموعی وضع اور جزئیات دونوں پر حاوی ہے ۔ کیونکہ پیشکش کا اثر لازمی طور پر مجموعی ہوگا اور اس میں بحر کے انتخاب کو بھی نمایاں دخل ہے ۔ جاوید نامہ کی پرشکوہ داستانی نوعیت زیادہ کشادہ لنواس اور طویل بحر کی مقتضی تھی ۔ چھوٹی بحر خود اصل کے بہاؤ پر بھی اثر انداز ہے اور ترجمہ میں تو تنگیٔ بحر کا احساس اور بھی نمایاں ہوتا ہے ۔ خصوصاً دیگر مثنویات میں جو من و عن بیان پر مشتمل ہیں ۔ اس کے باوجود ''پس چہ باید'' اور ''مسافر'' دونوں میں اصل بحر ہی کو برقرار رکھا گیا ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ

یہ تنکنائے بقدرِ ذوق ثابت ہوئی ہے یا نہیں - نیز اس بحر میں دونوں اطراف کی حد رسائی کیا ہے :

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ یہ حد دونوں زبانوں میں یکساں ہے اور کسی کو دوسری پر فوقیت نہیں - اصل اور ترجمہ ممکن ہے ایک دوسرے کے دوش بدوش رہیں یا بعض مقامات پر اردو پیش پیش ہو - یہ مصنف یا مترجم کی صلاحیت پر موقوف ہے البتہ یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ طویل بحر نسبتہً زیادہ کیف انگیز اور پُر طمطراق معلوم ہوتی ہے - اس میں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا اور شاعرانہ رنگ آمیزی کی زیادہ گنجائش نظر آتی ہے - ایک ہی قلم سے دونوں بحروں میں مشترکہ کلام سے یہ حقیقت بخوبی نمایاں ہو جاتی ہے - تاہم اصل اور ترجمہ کا سوال اور ہے - اصل بہرحال اصل ہے اور ترجمہ ترجمہ — نوائے زیر لبی جس میں کسی نہ کسی حد تک کمی لازم ہے - پھر بھی ''سرودِ رفتہ'' کے یہ دونوں روپ آپ کی خدمت میں پیش ہیں - خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم -

——— :o: ———